بسم اللہ الرحمن الرحیم

رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) کا

سہ ماہی اُردو ترجمان

کاروانِ ادب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

سہ ماہی **کاروانِ ادب** اسلامی

مجلس مشاورت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد اجتباء ندوی، دہلی
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب
پروفیسر ظہور احمد اظہر
ڈاکٹر محمود الحسن عارف
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، C.I.E.F.L. حیدرآباد
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

معاون طباعت

انیس احمد ندوی

مطبوعہ : مشہود انٹرپرائزز، لکھنؤ

کمپوزنگ: ....توفیق ندوی بہرائچی

زرِ تعاون

اس شمارہ کی قیمت	............-/۴۰ روپے
سالانہ برائے ہندوستان	............ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	............تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک	............چار سو روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں.....RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۱۴	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء	شمارہ نمبر ۳

عناوین		صفحہ
منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۴
نعت	ڈاکٹر کیف رضوی	۶
حضرت حسنینؓ کو باپ کی نصیحت	اظہر ندوی	۷
ادب میں علی میاں ندویؒ کے تجدیدی کارنامے، خصوصیات...	ڈاکٹر محمد رضوان الحق ندوی	۹
تحریک پیام انسانیت کے لئے مولانا ندویؒ کی فکرمندی	صباح اسماعیل ندوی	۱۴
مفکر اسلام کی فکر و نظر: تقاریر کے آئینہ میں	عارف عزیز (بھوپال)	۴۴
ادب برائے اسلام: حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا نقطۂ نظر	ڈاکٹر عارف اعظمی عمری	۴۹
مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریریں: ایک ادبی جائزہ	مولانا عبد القدیر قاسمی	۵۴
مفکر اسلام کے خطبات کی چند خصوصیات	محمد زید مظاہری، ندوی	۶۷
مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ملک وقوم کی فکر: خطبات....	ڈاکٹر کلیم الرحمٰن ندوی	۸۳
''ایمان کی قدر و قیمت'': حضرت مولاناؒ.........کی ایک تقریر	محمد معز الدین ندوی	۹۱
پا جا سراغ زندگی - ایک جائزہ	محمد ایوب صدیقی ندوی	۹۸
مولاناؒ کی ایک شاہکار تقریر	محمد ریاض فاروقی ندوی	۱۰۵
مسلم امت کے لئے ایک دردمند داعی کی دلسوزی...	قاضی مزمل الدین ندوی	۱۱۰
خطبات ندوی میں اثرات اقبال	ڈاکٹر شفیع احمد ہاشم ندوی	۱۱۹
'' فطاسیہ کا سیاح ''	اقبال ندوی انصاری	۱۲۹

محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

ادب ایک عظیم طاقت ہے۔اس کی اہمیت اور قوت وتاثیر سے انکار ممکن نہیں ہے، لیکن یہ دودھاری تلوار کی مانند ہے جو کاٹتی بھی ہے اور جان بھی بچاتی ہے، یہی حال ادب کا بھی ہے کہ اس سے تعمیر کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور تخریب کا بھی، اس سے لطف ولذت کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور اصلاح وتربیت کا بھی۔اور ہر زمانہ میں لوگوں نے اس سے دونوں طرح کے کام لئے ہیں، اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

یہ دور ادب وشاعری اور آرٹ کا دور ہے، معاشرہ کے اخلاق کو تباہ و برباد کرنے میں آج کل ادب اور میڈیا زیادہ مؤثر رول ادا کررہا ہے، پہلے الحاد دیگر راستوں سے آتا تھا۔اب ادب کے راستہ سے آرہا ہے۔ادب کا استعمال اگر صحیح طور پر کیا جائے تو وہ ملی خدمت اور انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے، اور اگر اس کا استعمال غلط کیا جائے تو وہی ادب تخریب اور شروفساد کا ذریعہ بن جاتا ہے، ادب غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی، یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، ادب اگر صحیح معنی میں ادب ہے تو قاری اور سامع اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان اپنے تأثر کو سچے طریقے سے بیان کرتا ہے تو وہ دوسرا انسان جو انہی احوال سے گذر رہا ہوتا ہے تو اسے بڑی تسکین وتقویت حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ ادب جس میں انسانی واخلاقی قدروں کا لحاظ نہ ہو، وہ اگرچہ کہنے کو ادب ہے لیکن وہ بے ادبی ہے، اور ایک بے سود شے ہے، اس میں نہ زندگی کی حرارت ہوتی ہے اور نہ قوت عمل، بلکہ وہ انسان کو بیکار اور اخلاقی

قدروں سے عاری انسان بناتا ہے، البتہ جو ادب زندگی کی حرارت سے لبریز اور قوت و تاثیر کا حامل ہو تو وہ ادب باقی رہتا ہے، اور قائم ودائم رہتا ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا ہے زمانہ گزرتا جاتا ہے اور اس کی طاقت وقوت جوں کی توں باقی رہتی ہے۔

ادب کے اسلامی تصور، اور اسلامی ادب کے سرمایے سے شاہکار ٹکڑے تلاش کرنے اور ان سے اصلاحِ سیرت وتصحیحِ معاشرت اور تعلیم وتربیت کا کام لینے کی آواز، خاص طور پر عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے آج سے تقریباً (۷۰) سال قبل مؤثر وفعال طریقہ سے حضرت مولا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بلند کی تھی، اور اپنے مضامین کے ذریعہ خاص طور پر عربی میں ادب کے خیر رکھنے والے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی تھی، بلکہ اس کے نمونے تلاش کرکے عربوں کے سامنے رکھے تھے۔ اس سے رابطہ ادب اسلامی کا ہمارا یہ کارواں بنا اور سرگرم سفر ہوا، اور اس کے تحت دنیا کے مختلف ملکوں میں قائم رابطہ کی شاخوں میں سیمیناروں، ادبی کانفرسوں، ادباء شعراء سے ملاقاتوں اور کتب ورسائل کی نشرواشاعت کے ذریعہ وقیع خدمت کا سلسلہ قائم ہوا۔

خود مولاناؒ نے ادب کے ذریعہ تعلیمی، تربیتی، اصلاحی، دعوتی اور سماجی بہت سے کام انجام دئے، ان کی تحریروں کے ادبی پہلو کے جائزہ کے لئے بمبئی میں ایک سیمینار رکھا گیا تھا، جس میں مقالہ نگاروں نے بہت سے مقالات پیش کئے، اور خاصے وقیع مقالات سامنے آئے، جن میں انہوں نے حضرت مولاناؒ کی ادبی تحریروں کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا تھا، ان مقالات کی دو قسطیں رابطہ ادب اسلامی کے سہ ماہی ترجمان کاروان ادب میں آچکی ہیں، اب ان مقالات کی تیسری اور آخری قسط دی جارہی ہے، امید ہے کہ حسب سابق یہ مضامین بھی پسند کئے جائیں گے اور مفید ثابت ہوں گے۔

☆☆☆

نعت

ڈاکٹر کیف رضوی

آیۂ نورِ مجسم صَلّی اللہ علیہ وسلّم
جلوۂ حسنِ خالقِ عالم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

نور ہے جس کا سب سے مقدم صَلّی اللہ علیہ وسلّم
ذاتِ مقدس افضل و اعظم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

عیسیٰؑ دوراں خضرؑ و سلیمانؑ موسیٰؑ عمراں یوسفِ کنعاں
سب سے اعلیٰ سب سے مکرم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

فرش کی نزہت، عرش کی زینت، مہرِ نبوت، ماہ رسالت
مالکِ کُل، مختارِ دوعالم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

وحی خدا ہر بات ہے جس کی، مصحفِ رخ ہے شرحِ تجلّی
جلوۂ حق ہے ذاتِ معظم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

آپ مدثر، آپ مُزمّل، راحت دل کونین کا حاصل
نور و سرور دیدۂ آدمؑ صَلّی اللہ علیہ وسلّم

دل کی تمنّا ہے یہی ہر دم طاری ہواک وجد کا عالم
میری زبان پر ورد ہو پیہم، صَلّی اللہ علیہ وسلّم

مدت سے ہوں شوقِ سراپا تیرے لئے اے گنبدِ خضریٰ
زخمِ جگر کا تو ہے مرہم، صَلّی اللہ علیہ وسلّم

جس کا رتبہ سب سے سوا ہے، کیف اسی سے اپنی دعا ہے
حشر میں انھیں کہتے ہوئے ہم صَلّی اللہ علیہ وسلّم

☆☆☆

حضرت حسنینؓ کو باپؓ کی نصیحت

ماخوذ از "عکس جمال"
عربی سے ترجمہ: اظہر ندوی

کرو شکر اللہ کی نعمتوں کا
تو وہ نعمتوں میں کرے گا اضافہ
نہ گھبراؤ کیسی ہی آئے مصیبت
ہے صبر و تحمل کا انجام اچھا
نہ حلم و تدبر سے دامن ہو خالی
کوئی ان سے بڑھ کر نہیں ساتھ دیتا
دَر آئے نہ پستی کبھی ذہنیت میں
ہو پیشِ نظر مرتبہ سب سے اونچا
نگاہوں کی ٹھنڈک نمازوں میں ڈھونڈو!
ہو چہرے پہ نور اس کا ہردم چمکتا
کرو رزق اچھے طریقوں سے حاصل
نہیں اس میں ہوگا خسارے کا سودا
خدا ہی کے ذمے ہے سب کی کفالت
کبھی کم نہیں ہوتا اس کا خزانا
حیا اور غیرت عیاں ہو جبیں سے
ادا حق کرو دوستوں کا ہمیشا
نہ کردار و اخلاق پر ضرب آئے
نہ چھوٹے کبھی ساتھ صدق ووفا کا

ہو مہمان کی جان و دل سے ضیافت
سدا تم سے ہمسایوں کا حق ہو پورا
نہ دولت کمانا ہی پیشِ نظر ہو
کمانے کی شے سب سے بڑھ کر ہے تقوا
ہے مقصود مومن کا ذکرِ الٰہی
ہو معمولِ صبح و مسا ذکر اس کا
تلاوت ہو قرآن کی مخلصانہ
عمل اور تقرب ہی اس کا ہو منشا
معانی پہ اس کے ہو غور و تدبر
ہوآنکھوں میں سیلاب اشکِ رواں کا
خطائیں ہوں اپنی نگاہوں میں روشن
دعا ہو، کرے درگذر ان سے مولا
کرو جلد پورا، رکاوٹ سے پہلے
اگر دل میں ہو نیک کوئی ارادا
نہ ہو چاپلوسوں سے کوئی تعلق
نہ جھوٹوں کی صحبت کبھی ہو گوارا
نصیحت یہ ہے باپ کی جس سے بڑھ کر
نہیں کوئی دنیا میں مخلص تمہارا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد رضوان الحق ندوی

ادب میں علی میاں ندویؒ کے تجدیدی کارنامے

خصوصیات، امتیازات

(دوسری اور آخری قسط)

اس محاذ کی سنگینی دوہری تھی، داخلی اور خارجی دونوں مورچہ سنگین تھے، خارجی محاذ پر اپنے مقابل سے نبرد آزما ہر فریق ہوتا ہی ہے البتہ ہوشمندی اور جنگی بصیرت سے کی گئی تیاری کے کیف وکم پر فتح وظفر کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن اگر داخلی محاذ پر کوئی کمزوری ہو تو زبردست تیاری کے باوجود خارجی محاذ پر مثبت انجام تک پہنچنا مشکوک ومشتبہ رہتا ہے، ایسا ہی کچھ معاملہ یہاں بھی ہے۔ دین کے علمبردار سپاہی جس کے قلعے مدارس اسلامیہ ہیں، فکری اعتبار سے یک گونہ پست حوصلگی کا شکار تھے۔ ذہن کے کسی نہ کسی گوشہ میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ شاید وہ وقت کی ضرورت نہیں اور زمانہ کو بھی ان کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہاں اجنبی ہیں، چھوٹی سے چھوٹی مقدار ہی میں سہی لیکن کسی نہ کسی حد تک اہل ایمان ویقین میں کچھ ایسی کمزوری بلکہ مرعوبیت محسوس کی گئی، یہ بہت ہی خطرناک بات تھی، اس سے فوراً نکل آنا اور کسی مرد آگاہ کا بڑھ کر نکال لانا زندگی کی سب سے پہلی ضرورت تھی، مولانا نے اول ہی مرحلہ میں اس کو بھانپ لیا تھا اور پتہ لگا لیا کہ یہ صورت حال اسلامی ادبیات کے متبادل ادب سے پیدا ہوتی ہے، بے چین ہو گئے، قرار جاتا رہا،

نکل پڑے، آج ندوہ تو کل دیوبند، ابھی سہارنپور تو دوسرے پہر مظفر پور، صبح عجم تو شام عرب، ہر گلی کوچہ میں پھرے اور مسلسل پھرتے رہے، ان کے شیریں و مترنم نغمے دل کا دکھ بانٹتے رہے، حسین و موثر پیرایۂ بیان سے دلوں کی ڈھارس بندھاتے رہے، جوڑتے رہے، سمجھاتے رہے کہ تم ہی زندگی کی پہلی اور آخری ضرورت ہو، تمہیں سے زندگی کی تابانی ہے اور تمہیں سے زندگی میں حرارت ہے، دنیا پیاسی ہے اور تم چشمۂ حیواں ہو، تمہارا قلعہ زندگی بداماں ہے، زندگی کا منبع و مرجع ہے، فرمایا:

"میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کے صلاحیت رکھنے والا، اور حرکت و نمو سے لبریز پاتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے، وہ نبوت محمدیؐ کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کی ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدی کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدیؐ کے چشمہ فیض سے بخل و انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے "اِنما أناقاسِمٌ واللہ یعطی" کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے "ھل من مزید، ھل من مزید" کی فغان مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ، متحرک اور معروف ادارہ ہوسکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی غلطیاں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار،

مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہرادارہ، ہرمرکز، ہرفرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہرمسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے۔"

(پاجاسراغ زندگی: ص، ۹۰، ۹۱)

اب اگر ان سپاہیوں میں احساس کہتری پیدا ہو جائے تو یہ بجائے خود سب سے بڑا فتنہ ہے، بہت بڑا ذہنی طاعون ہے، اولین فرصت میں اس کا علاج ضروری ہے، ان سپاہیوں کو ذہنی دباؤ سے نکال لانا ان کے سالار کا سب سے پہلا فرض ہے، اور یہ کام تجربہ کار، فراست و دانائی سے بھرپور کوئی صاحب دل سالار ہی کرسکتا ہے، ہمارے حضرتؒ تقدیری طور پر اس کام پر مامور تھے، آپ بڑھے اور آپ نے ان کو سمجھایا:

"آپ کے پاس جو دولت ہے، اس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپ کے سینے میں علوم نبوت ہے اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں، اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب و انتشار ہے، شر و فساد ہے۔"

(پاجاسراغ زنگی: ص، ۹۸، ۹۹)

اور اسی طرح داخلی محاذ کو آپ نے درست کیا، صفیں سیدھی کیں اور خارجی محاذ کی طرف متوجہ ہوئے، اس خارجی محاذ پر تو آپ نے اپنے مشن کا باضابطہ آغاز "روائع اقبال" سے کیا جو اردو میں "نقوش اقبال" کے نام سے مقبول عام و خاص اور معرکۃ الآراء تصنیف ہے، اس "روائع" کا محرک بھی وہ عجب حادثہ بنا جسے عظیم سانحہ کہنا چاہئے، جو عرب مؤلفین، مصنفین، ادباء و خطباء کو اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹا کر غلط راہ پر ڈال رہا تھا،

نوبل انعام یافتہ ہندوستانی ادیب وفنکار رابندرناتھ ٹیگور کی تخلیقات کے فرانسیسی ترجے عرب دنیا خاص کر مصروشام ونواح میں پہونچ رہے تھے اور اس راہ سے رابندرناتھ ٹیگور کی چیزیں عرب دنیا میں مقبول ہورہی تھیں، عرب نوجوان، ادباء اور فنکار ٹیگور کو چیزوں کو دلچسپی سے پڑھ رہے تھے اور متاثر ہورہے تھے۔ یہ تھا وہ حادثہ جس نے مولانا کو بیحد متاثر کیا، علامہ اقبالؒ جو علم، ادب اور فن کے اوج کمال پر ہیں، انہیں عرب دنیا جانتی بھی نہیں، اگر اقبال کو یہ عرب جان لیں اور ان کے ذریعہ پیش کردہ چیزوں کی ادبی وفنی حیثیت سے آگاہ ہوجائیں تو ان کے سامنے ادب وفن کا بھی ایک مثالی نمونہ ہوگا اور انہیں خود اپنی تہی دامنی کا گلہ بھی نہ ہوگا کہ ''در سینۂ تو ماہ تمامی نہادہ اند'' کی خبر اقبال ہی کے پاس ہے، یہ صرف اس لئے کہ اقبال عربی زبان میں اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے، اور کسی صاحب قدرت مردآگاہ نے انہیں عربی میں منتقل کرنے کا کام بھی نہ کیا تھا۔ ظاہر ہے مولاناؒ سے بڑھ کر اس کام کے لئے موضوع اور کون ہوسکتا تھا، مولانا مشرق ومغرب کے ادب سے پوری واقفیت حاصل کرچکے تھے۔ اقبال کو حرفاً حرفاً پڑھا تھا، ملاقات بھی ہوچکی تھی، اقبال کو عربوں کے سامنے لانا ضروری تھا اور یہ کام آپ کے مشن کا حصہ بھی تھا، اس کے ذریعہ علم، ادب اور فن میں اپنی عظمت سے عرب واقف بھی ہوسکتے تھے۔ اس حادثہ نے مولانا سے ''روائع'' لکھوایا، ''روائع'' کو فوراً اردو میں منتقل کیا، اس لئے کہ یہاں عجم خاص کر برصغیر ہند میں یہ ادبی رویے ۱۹۳۶ء میں باضابطہ تحریک بن کر ہر میدان کو پراگندہ کرنے کا آغاز کرچکے تھے۔ ''روائع'' اور ''نقوش'' نے عرب اور عجم میں ذہن بدل دیا، مزاج بدل دیا، فکر کی رو کو موڑ دیا اور ایک نیا رجحان، خیر کا رجحان پیدا کردیا۔

حضرت مولاناؒ کی تمام تحریریں، تقریریں اور تصنیفات کو، گھومنے پھرنے، تگ ودو اور جدوجہد کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ سرسری نگاہ سے بھی یہ حقیقت واضح طور پر

سامنے آتی ہے کہ مولانا اسلام کے مرکز اور اس کے زیر اثر ممالک کو علم وادب کی اصلی شکل دکھانا چاہتے تھے اور پراگندگی کو دور کر کے ان کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے اور آپ نے یہی کیا۔ آپ نے ڈھیر سارے غموں کو پیا تھا، ان گنت صدمے سہے تھے، اس لئے آپ کی زبان رواں، مضامین صداقت سے لبریز، دل جذبات کی گرمی سے تپا ہوا، انداز، حسن بیان کا خوبصورت مرقع، اور ان سب پر ملکوتی تقدس مستزاد، ان عناصر نے ادب کے مزاج کی گندگی کو دور کیا، طبیعت کے فساد کو زائل کیا، ادب کو فطرت سے قریب بلکہ ہم آہنگ کیا، اسے زندگی کے حقائق اور معارف کا گنجینہ بنایا، ادب کے چہرے کو حسن اور سیرت کو پاکیزگی عطا کی۔

عنفوان شباب سے شروع کئے گئے اس مشن کو آپ نے ۱۹۸۵ء میں منظم کیا اور ''رابطہ ادب اسلامی'' قائم کر کے عرب وعجم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، تاکہ ادب کے معماروں کا یہ قافلہ چلتا رہے، مسلسل رواں دواں رہے، یہاں تک کہ ایک ایک ذہن صاف ہو جائے، ایک ایک دل منور ہو جائے اور انسانیت کا جسم ایک ایک زخم، داغ، دھبہ سے صاف ہو کر گداز ہو جائے جسے ہر کوئی اپنے پہلو میں جگہ دے کہ یہی مطلوب ہے اور یہی مقصود بھی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ادب میں یہی تجدیدی کارنامہ ہے اور بلاشبہ آپ اس عہد کے مجدد ہیں۔

☆☆☆

صباح اسماعیل ندوی، علیگ

تحریک پیام انسانیت کے لئے مولانا ندویؒ کی فکرمندی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اصل مزاج علمی وفکری تھا اور مطالعہ وتصنیف ان کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے اظہار کے لئے کسی مضبوط دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ حضرت مولاناؒ کی حیات ہمہ جہات کا سرسری مطالعہ بھی واضح کرتا ہے کہ انہیں علم وادب، تصنیف وتالیف، تحقیق وتدقیق اور وعظ وتلقین سے جنون کی حد تک شغف ولگاؤ تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس میں مشغول رہے۔ حضرت مولاناؒ اپنی تمام تر لیاقت وقابلیت اور خاندانی تعلق ونسبت کے ساتھ نہ صرف ان کاموں میں مشغول رہے بلکہ ان کے علم وفکر اور جذبۂ ہمدردی وخیر خواہی نے عظیم تالیفات وتصنیفات کی شکل میں دنیا کو وہ لعل وجواہر دئے جن پر صدیاں ناز کریں گی۔ بلاشبہ ایسی عظیم شخصیت سے جو ملک وملت اور قوم ووطن کے اہم ترین مسائل کے لئے مسلسل فکرمند رہی ہو اور جس نے عالمی وبین الاقوامی مسائل کے حل کے لئے بھی مستقل سربراہان مملکت اور رہنمایان مذاہب کو قیمتی اور مفید مشورے دئے ہوں، یہ توقع رکھنا کہ وہ معمولی مسائل پر بھی متوجہ رہی ہو اور سڑکوں کو کیلوں کے چھلکوں سے پاک کرنے تک کے لئے فکرمند رہی ہو زیادتی اور ناانصافی ہے مگر حضرت مولاناؒ کی سیرت و شخصیت کا مطالعہ کرنے والا اس وقت انتہائی حیرت واستعجاب میں مبتلا ہوجاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ انہوں نے عظیم مسائل کے بوجھ تلے دب کر معمولی مسائل سے چشم پوشی

نہیں کی ہے بلکہ ان کے حل کے لئے بھی اسی سنجیدگی وفکر مندی کا مظاہرہ کیا ہے جس فکر مندی کا مظاہرہ وہ بڑے مسائل کے لئے کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس کام کے لئے باقاعدہ ''حلقۂ پیام انسانیت'' اور ''تحریک پیام انسانیت'' کے نام پر کوششیں کیں اور پوری توجہ وانہماک سے یہ سعی بھی کی کہ سڑکوں اور گلیوں کے معمولی مسائل بھی حل ہوں اور لوگوں کے دلوں میں جمی ہوئی گندگیوں کی بھی دھلائی اور صفائی کی جائے۔

حضرت مولاناؒ پورے انہماک واہتمام کے ساتھ علمی، وادبی اور دینی کاموں میں مشغول تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کے اندر فساد اور بگاڑ عام ہو رہا ہے۔ ملک کے اندر اخلاقی انار کی انتہا کو پہنچ رہی ہے اور وہ گھر برباد ہو رہا ہے جس کو بنانے اور سنوارنے پر ان کے اسلاف نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کی تھیں تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے رفقاء کے ساتھ سڑک پر نکل کر ایک ایسی تحریک چلانی ہوگی جو لوگوں کو بتائے کہ وہ اپنی جہالت وحماقت سے اجتماعی خودکشی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ تحریک عوام الناس کو سمجھائے کہ انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام ہر کام پر مقدم ہے۔ حقیر شخصی فوائد کے لئے اجتماعی وملکی مفاد کو آسانی سے قربان کرنا نادانی ہے اور کام چوری، غیر ذمہ داری، رشوت خوری، ذخیرہ اندوزی اور بدعنوانی ایسی چیزیں ہیں جو بہت جلد ہمارا جنازہ نکال دیں گی، وہ جہاز عنقریب غرق ہو جائے گا جس میں لوگ سوار ہو کر روز بروز نئے نئے سوراخ کرتے جا رہے ہیں اور وہ شاخ جلد ہی زمین بوس ہو جائے گی جس پر ہمارا نشیمن قائم ہے۔

تحریک پیام انسانیت کا آغاز کب ہوا اور حضرت مولاناؒ نے کیوں اس کام کو ترجیح دی، اس تعلق سے تعمیر حیات لکھنؤ کے سابق ایڈیٹر مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے مولاناؒ سے دریافت کرتے ہوئے سوال کیا تھا کہ:

''کیا آپ کے لئے اس کی گنجائش نہ تھی کہ آپ اپنے تصنیف وتالیف کے کام اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ کی خدمت وترقی میں معروف رہتے، آپ شروع سے ''تبلیغی جماعت'' کے اہم داعی، ترجمان اور اس کے مقاصد کے شارح اور مبلغ رہے ہیں اور آپ کو اس جماعت کے خلوص ومقبولیت، اس کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات پر اب بھی اطمینان ہے۔ پھر جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ ہندستان کے کئی اہم تعلیمی و تصنیفی اداروں کی انتظامی کمیٹیوں کے رکن بھی سالہا سال سے چلے آرہے ہیں۔ آپ پوری یکسوئی اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے اسلاف اور بزرگوں اور استادوں کی طرح اداروں کی خدمت میں مصروف رہ سکتے تھے، میرے نزدیک کوئی شخص بھی جو آپ کے طبعی مذاق، صحت کی کمزوری اور خاندانی گوشہ پسندی سے واقف ہے آپ کو ملامت نہ کرتا، اور نہ اس سلسلے میں آپ کا گریباں گیر ہوتا۔''

حضرت مولاناؒ نے اس کا نہایت خوبصورت جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

آپ نے بڑا اچھا سوال کیا اور بڑی خوبی سے میرے لئے اپنے علمی کاموں میں انہماک اور اپنے میدان عمل کے انتخاب کے لئے عذر تلاش کرلیا، لیکن میں اس اندرونی اور اس بدیہی حقیقت کو کیسے نظر انداز کردوں کہ کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی وتعمیری کاموں کے لئے (خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری، اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل (Normal) حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی وتعمیری کام کے لئے دماغی سکون، اور

ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں، اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسان پر اعصابی (ہسٹریا کے) دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت وقوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو، اور جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ:

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے، نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے، کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہو کر انسانوں کی جان لے لے، اس لئے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پڑھا لکھا آدمی کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی میں ہوا، ایک ہی کالج میں پڑھانے والا استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے، طالب علم، طالب علم کی مخبری کرے اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے۔"

اور یہ دورے کسی وقت بھی معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں، اور لوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں، وہاں کسی تعلیمی و تعمیری کام یا ادارے کی بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے، اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے؟ بقول میر:

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب و شاعری اور فنون لطیفہ اور اقبال کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ" کی بھی کیا گنجائش ہے؟ اور یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانہ

کے حوادث ہیں، جہاں سوسائٹی اتنی مسخ (Corrupt) ہوجائے کہ کسی کو بغیر رشوت دیئے نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام سے سفر کرسکے، طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں نہ استاد پڑھانے کی طرف، انتظامیہ کے سب کام بے عمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ اور قیام مخدوش ہوجائے وہاں اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لئے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

اس بناء پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کی تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لئے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لئے اس تحریک کو میں تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت و تحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے، کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فراش یا سقہ، یا زمین برابر کرنے والے، یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ یا اجتماع ہوسکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو، یا تعلیمی بحث و مذاکرہ کا۔

حضرت مولاناؒ نبی رحمتؐ کے پیروکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صرف امت مسلمہ کی خیر خواہی کو ہی اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ پروردگار عالم کی زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو رشد و ہدایت پر جمع کرنے اور انہیں انسانیت و اخلاق کا درس دینے کی کوشش کی۔

اس راہ میں کی جانے والی ان کی کوششوں نے عملی روپ ۱۹۷۴ء میں اختیار کیا اور اس کا باقاعدہ آغاز ''تحریک پیام انسانیت'' کے نام سے الہ آباد سے ہوا مگر انسانیت کے لئے کڑھن اور ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال کی اصلاح کے لئے تڑپ حضرت مولاناؒ کے دل میں ملک کی آزادی کے ابتدائی ایام ہی سے تھی۔ حضرت مولاناؒ خود اس کا اظہار اس

طرح کرتے ہیں:

"میں نے تقسیم اور ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین اور رسائل کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے" کے عنوان سے نکلا تھا جس کا ہندی، انگریزی ترجمہ میں نے اس وقت ملک کے تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزرائے اعلیٰ کو بھیجا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء کے آغاز میں شروع ہوئی، اس سلسلے کی پہلی تقریر جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا۔ ۹ر جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، اس زمانہ میں تبلیغی دورے کے ساتھ اس جزء کو شامل کیا گیا تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا جس میں جونپور، غازی پوری، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے ملے جلے اجتماعات ہوئے، اس دورے کی تقریریں ایک مجموعہ میں جمع کردی گئی ہیں۔ جس کا نام ہی "پیام انسانیت" ہے اس سلسلہ کا دوسرا نمبر "مقام انسانیت" کے نام سے شائع ہوا، لیکن کچھ ہی دن کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس تبلیغی دوروں کے ساتھ ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوگا، ادھر یہ احساس غالب آنے لگا کہ ایسی تقریروں کے لئے جن احتیاطوں اور رعایتوں کی ضرورت ہے ان پر سب کو قدرت نہیں، اس لئے ان تقریروں کا بوجھ

زیادہ تر اس ناچیز اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ پر تھا۔ اور جہاں ہم نہ ہوتے وہاں اس کا کوئی اجتماع بھی نہ کیا جاتا۔

ادھر میرے بیرونی ملک کے سفر پیش آنے لگے کہ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت آئی اور کئی مہینے ملک سے باہر رہا، وہاں سے آنے کے بعد اپنے دوسرے تصنیفی و علمی مشاغل میں مصروف ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ مجھے ساری عمر اس کا قلق رہے گا کہ یہ سلسلہ کیوں نہ جاری کیا گیا، میں اس کو اپنی ایک اخلاقی کوتاہی سمجھتا ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس پر ہمارا محاسبہ نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو رفقاء بھی تیار ہو جاتے اور ملک کے فضا پر بھی اس کا اثر ضرور پڑتا، اس طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد سے پھر اس مہم کا آغاز کیا گیا۔“

(تحریک پیامِ انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو)

”حلقۂ پیام انسانیت“ کی حقیقت کیا ہے اور کیوں یہ تحریک حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکرمندی کا محور بنی، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ہمنشین و جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی رقمطراز ہیں:

”ہندوستان میں آزادی کے بعد ضرورت تھی (کہ یہ ملک ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کی مل جل کر کوشش سے آزاد ہوا) کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے تحفظ و ترقی کے مسائل کو بھی یہ سب فرقے مل جل کر حل کرتے اور اجتماعی زندگی کو خوشگوار بنانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، ہندوستان کا دستور بھی اسی طریقے کو واضح کرتا ہے، لیکن افسوس

کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد سے مسائل کے حل کرنے میں خاندانی، مذہبی اور طبقاتی رشتوں کو زیادہ بنیاد بنایا جانے لگا، اس کی وجہ سے وطنی اور ملکی مفادات کو مدد ملنے میں بڑی کوتاہی ہوئی، اور دیگر طبقاتی اور مذہبی ٹکراؤ اور کشمکش کے حالات پیدا ہو گئے، انسانی رشتہ کے تقاضے بھی اس میں نظر انداز ہونے لگے اس کی وجہ سے ملک میں یکجہتی کے ساتھ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، یہ بڑی قابل اصلاح کمزوری اور نقص ہے، جس کی طرف توجہ اچھے اچھے اہل دانش نے بھی بہت کم کی، ہر ایک نے اپنی کسی محدود اجتماعیت کی فکر تک اپنے کو محدود رکھا۔''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو اگرچہ بنیادی طور پر مذہبی اور علمی وتعلیمی آدمی تھے اور مذہبی، علمی وتعلیمی کاموں میں لگے ہوئے بھی تھے لیکن ان کو اس بات کا بہت احساس تھا، انہوں نے دیکھا کہ کسی نے میونسپلٹی کا نل کھولا اور دیکھا کہ وہ نل کو کھلا چھوڑ گیا اور گزرنے والے گزر رہے ہیں کوئی بند نہیں کرتا، سب یہ سوچ کر رہ جاتے ہیں کہ یہ میونسپلٹی کا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ریل کے ڈبے میں بیٹھا ہوا شخص کیلا کھا رہا ہے اور چھلکے سامنے پلیٹ فارم پر پھینک رہا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ گزرنے والوں میں سے کسی کا پیر پڑے گا اور وہ گر پڑے گا، ہاتھ پیر کی ہڈی ٹوٹ سکتی ہے، کوئی اور نقصان ہو سکتا ہے۔ پلیٹ فارم پر چلنے والے بھی اس خطرہ کو نہیں سوچتے وہ صرف اپنے کو بچا لیتے ہیں باقی کی فکر نہیں، حالانکہ بہت آسان تھا کہ کوئی بھی لکڑی کے ذریعہ یا اپنے پیر کے جوتے کے ذریعہ اس کو لائن کی طرف ہٹا کر گرا دیتا۔

مولانا کو خیال ہوا کہ انسانی رشتہ کی بنیاد پر ہر ایک پر اس کے لئے فکر و توجہ کرنے کی

ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اسلام کے لحاظ سے حلف الفضول میں بھی حضور سیدنا محمد ﷺ کی طرف سے اس کی تائید ملتی ہے چنانچہ انہوں نے خود اس کام کا آغاز کیا کہ انسان کو انسان کی ہمدردی کرنا چاہئے اور اس کو تحریک بنانے کی کوشش کی اور اس کا نام "حلقۂ پیام انسانیت" رکھا۔"

حضرت مولاناؒ کے نزدیک اس کام کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ بعض لوگوں نے یہاں تک کہا کہ یہ تحریک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مولاناؒ نے ان کی پرواہ نہیں کہ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں باعزت طریقے سے زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنی نافعیت ثابت کریں اور ملک میں موجودہ اخلاقی قیادت کے خلا کو پر کریں، بقول مولانا ندویؒ:

> "میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہونچے اور ملک کو فائدہ پہونچ جائے جب بھی ان کو یہ کام کرنا چاہئے، وہ اپنے دین ومنصب کے لحاظ سے اس کے لئے مامور ہیں اور ملک کے ہر فائدے میں شریک، لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقے پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پر کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت وضرورت اور بے لاگ و بے غرض قیادت و دعوت کے بغیر عزت و اطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

"پیام انسانیت" کے لئے حضرت مولاناؒ کی فکرمندی وجاں سوزی کا ایک سبب یہ بھی

تھا کہ حضرت مولاناؒ ملک کے باشندوں کے درمیان اتفاق واتحاد اور الفت ومحبت کا پیغام عام کرنا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک یہی وہ تحریک تھی جو "لکم دینکم ولی دین" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی ملک کو آشتی وشانتی کا گہوارہ بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس طرز پر اس سے قبل اور اس کے بعد بھی جتنی کوششیں ہوئی ہیں وہ وحدت انسان کے بجائے وحدت ادیان کی دعوت دینے والی بن گئی ہیں۔ حضرت مولاناؒ خود اس کے تعلق سے ارشاد فرماتے ہیں:

> ”درحقیقت یہ تحریک وحدت ادیان کی نہیں وحدت انسان کی ہے، اس لئے ہم ان تقریروں میں اس سے امکانی حد تک احتیاط برتتے ہیں، کہ ان میں مذہب کی دعوت دی جائے، ہم صرف اخلاق، خداترسی، انسان دوستی اور اخلاقی اور شہری شعور کی دعوت دیتے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ یہ اس غیر مسلم اکثریت کے ملک میں اس ”حلف الفضول“ کی ایک تقلید ہے جو بعثت سے قبل مکہ معظمہ میں ایک انجمن یا معاہدہ کی شکل میں قائم ہوا تھا، جس کے اہم دفعات یہ تھے کہ ”ہم ملک سے بے امنی دور کریں گے، مسافروں کی حفاظت کریں گے، غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے، زبردست کو زیردست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے“ آنحضرت ﷺ اس میں شریک تھے، اپنے نبوت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام سے کسی کو مدد کے لئے بلائے تو میں سب سے پہلے اس کی مدد کو تیار پایا جاؤں گا۔“

حضرت مولاناؒ کے نزدیک یہ تحریک انتہائی اہمیتوں کے حامل تھی، اسی لئے انہوں نے اس موضوع کے تحت سیکڑوں صفحات رنگین کئے، سیکڑوں مقامات کا دورہ کیا، سیکڑوں

لوگوں سے تعلقات قائم کئے، سیکڑوں جگہوں پر تقریریں کیں، سیکڑوں ایام اس کی خاطر وقف کئے، سیکڑوں راتیں اس کی فکر میں صبح کیں اور سیکڑوں لوگوں کو اس تعلق سے خطوط لکھے، فی الوقت ہمارا موضوع وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اس تحریک کے اپنے اہم ترین ساتھی کو اس تعلق سے لکھے ہیں اور خود ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔

مفسر و مبلغ قرآن اور داعی پیام انسانیت حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کے نام ان کے مرشد روحانی کے ان خطوط پر نظر ڈالنے سے قبل جو ''تحریک پیام انسانیت'' کے لئے مولانا ندویؒ کی فکرمندی کا ثبوت پیش کرتے ہیں ان خطوط کے تعلق سے اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ الفاظ و انداز کا حسین گلدستہ نہیں ہیں بلکہ افکار و احساس کی ایسی دنیا ہے جو انسان کو سیدھے حقیقت کا پتہ بتاتی اور فی الفور اس کے لئے متحرک ہو جانے کی دعوت دیتی ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی طویل علمی، فکری، دینی، تعلیمی، تبلیغی، ادبی اور تحریکی زندگی میں بہت سارے لوگوں کو خطوط لکھے۔ ان کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور مزید اشاعت کے منتظر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کے بھی مجموعہ خطوط فن طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے خط بنام ملکۂ سبا سے لے کر حضرت مولاناؒ کے خطوط تک بے شمار خط لکھے گئے ہیں۔ یہ خط اس وقت کم لکھے جاتے تھے جب اس کی ترسیل کے ذرائع معدوم تھے اور اب بھی پہلے کے مقابلے میں کم ہی لکھے جا رہے ہیں۔ خطوط کی ترسیل کے لئے آج جیسی سہولت کبھی نہیں رہی ہے مگر اس کے باوجود فون، موبائل فون، اور انٹرنیٹ نے انسانوں کو اس کی ضرورت سے لگ بھگ بے نیاز کر دیا ہے۔ ہم حضرت مولاناؒ کے خطوط کو مکتوبات کے آخری سنہرے دور کی یادگار بھی قرار دے سکتے ہیں، اس لئے ہمارے نزدیک ان کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

خطوط کے اہم مجموعے جیسے انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام، خطوط ابوالفضل، غالب کے خطوط، مکتوبات مجدد الف ثانیؒ، ملفوظات تھانویؒ، خطوط محمد علیؒ، مکاتیب سرسید، مکتوبات اقبال، خطوط مشاہیر، مکتوبات ماجدی، غبار خاطر اور خطوط ابوالکلام آزاد قارئین وادب کے سامنے ہیں۔ اوران سب کی اپنی خصوصیتیں ہیں مگر حضرت مولاناؒ کے خطوط اس معنی میں ان سے مختلف ہیں کہ یہ نہ صرف بیسویں صدی کے آخری نصف کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں بلکہ اس دور کے خطوط ہیں جسے ہم خطوط کا آخری سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔ مولانا پاریکھ صاحب کے نام جو خطوط ہیں وہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۹ء یعنی بیسویں صدی کے ربع آخر کا حاطہ کرتے ہیں اوران میں مولانا ندویؒ نے اپنے رفیق وحبیب سے دنیا بھر کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ تحریک پیام انسانیت کا آغاز ۱۹۷۴ء کے آخری ایام میں ہوا تھا گویا ان خطوط میں تحریک پیام انسانیت کی مکمل تاریخ بھی جمع ہے۔

حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب مولانا ندویؒ کے تحریک پیام انسانیت کے اہم ترین ساتھی ہیں بلکہ ان خطوط کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس تحریک نے ان دونوں کو قریب کیا تھا۔ مولانا پاریکھ صاحب اپنے طور پر اس انداز میں کام کررہے تھے مگر مولانا ندویؒ نے یہ تحریک شروع کی تو مولانا پاریکھ صاحب بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے اور اخیر تک یہ سلسلہ وتعلق قائم رہا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق اتنا مضبوط ہوا کہ اوروں کے لئے باعث رشک بن گیا۔ حضرت مولاناؒ کا یہ بیان اس باب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ:

> ”میرا دل آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کو اپنے لئے بیش قیمت ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہوں، آپ کے تعلق و مساعی کو اپنی مغفرت و سرخروئی کا ذریعہ جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت وقوت کو ترقی دے، اور آپ سے زیادہ سے زیادہ اپنی مخلوق کو فائدہ پہنچائے۔“

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا پاریکھؒ کی عظمت اوران کے طالع کی یہ ارجمندی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے لئے باعث رشک ہوگی۔ یہ نصیب اللہ اکبرلوٹنے کی جائے ہے۔ ترجمان قرآن مولانا پاریکھ صاحب حضرت مخدوم و مربی دامت برکاتہم کی تحریک "پیام انسانیت" کے داعی ہی نہیں بلکہ اس کام میں حضرت کے قوت بازو، رفیق راہ اور ہر طرح سے قابل اعتماد ترجمان ہیں۔ مولانا پاریکھ مفسر و مبلغ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک واعظ خوش بیان بھی تھے۔ اپنی باتوں اور میٹھے بول سے دلوں کو موہ لیتے، عاجز راقم کا احساس یہ ہے کہ یہ بھی حضرت مولاناؒ کی دعاؤں اور توجہات قلبی کا اثر ہے۔"

"تحریک پیام انسانیت" میں مولانا ندویؒ کے سب سے پرانے رفیق اسحاق جلیس ندوی مرحوم ہیں مگر وہ زیادہ دیر رفاقت کا حق ادا نہ کر سکے، اور دنیا کا ہر کام چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے، ان کے بعد مولانا پاریکھؒ ہی اس کام میں مولاناؒ کے اہم ترین دست و بازو اور رفیق کار رہے ہیں لہذا 'پیام انسانیت' سے مولانا ندویؒ کے قلبی و ذہنی تعلق کو سمجھنے میں ان خطوط کی بہت اہمیت ہے جو مولانا ندویؒ نے مولانا پاریکھ صاحب کو تحریک پیام انسانیت کے تعلق سے تحریر فرمایا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا تحریک پیام انسانیت' سے جو رشتہ تھا وہ جس سنجیدگی و جاں سوزی کے ساتھ اس کے لئے فکرمند رہتے تھے اسے سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ اہمیت ان خطوط ہی کی ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اس ساتھی کے نام تحریر کئے ہیں جو ابتدا تا انتہا اس تحریک میں ان کے دست و بازو رہے ہیں۔ پیام انسانیت کے نام پر لکھی گئی تحریریں اور اس کی خاطر کی گئی تقریریں بھی اس حقیقت کو کما حقہ

سمجھنے میں اتنے مددگار نہیں ہوسکتیں کہ ان میں بہت ساری چیزوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔ تحریر وتقریر دونوں ہی چیزوں کا عوام سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے اس میں بسااوقات دل کی بات اپنے اصلی رنگ میں جگہ نہیں بنا پاتی ہے، اس کے برعکس خط جو دورفقائے کار کے مابین تبادلہ خیال ہوتا ہے اس میں اصلی اور سچی باتیں خوب جگہ پاتی ہیں، بالخصوص حضرت مولاناؒ کے خطوط اس معاملے میں زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں کیونکہ مولاناؒ کے یہاں صنائع و بدائع کی کثرت میں معنی ومقصود حقیقی کے گم ہوجانے کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر بھی نہیں۔

اب ہم ان خطوط کے مجموعے کے حوالے سے مولانا ندویؒ کی پیام انسانیت کے لئے فکرمندی کا جائزہ لیتے ہیں جو'فرید بک ڈپو، دہلی' کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے اور جس کا عنوان ہے 'مرشد روحانی مصلح امت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ صاحب عرف علی میاں صاحب کے خطوط مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کے نام۔

یہ تحریک حضرت مولاناؒ کے دل کی آواز تھی مگر وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ راہ آسان نہیں ہے، اس کے باوجود وہ اول روز سے ہی اس کے تعلق سے پرامید تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی حفاظت و بقا کے لئے لوگوں کو اس کی طرف ضرور متوجہ کرے گا۔ تحریک کے ابتدائی ایام میں حضرت مولاناؒ اس تعلق سے اپنے رفیق کار کو امید دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

مورخہ: ۵-۷-۱۹۷۵ء خط نمبر: ۲

'انسانیت کا پیام نقار خانہ میں طوطی کی آواز کی بھی حیثیت نہیں رکھتا، جو کچھ امید ہے وہ اس سے کہ اللہ اپنی مخلوق کو مکمل طریقہ پر برباد ہونے نہیں دے گا۔"

''تحریک پیام انسانیت'' کے لئے حضرت مولانا مسلسل فکر مند رہتے تھے۔ وہ بیرون ملک دیگر دینی، علمی و دعوتی کاموں میں مشغولیت کے باوجود اس کے تعلق سے غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ اس دوران حضرت مولاناؒ نے محسوس کیا کہ ان کے اس کام میں مولانا پاریکھ صاحبؒ ان کے بہترین معاون ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے انہوں نے صراحت سے مولانا پاریکھ صاحب کو اس کی تاکید کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ کیا:

مورخہ: ۱۳-۴-۱۹۷۶ء خط نمبر: ۶

''اس سفر میں آپ کا خیال برابر آتا رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کو خط لکھنے کا تقاضہ پیدا ہوا۔ یہ بھی خیال آیا کہ آپ کو اپنے دعوتی اور تربیتی کاموں بالخصوص ''پیام انسانیت'' کی تبلیغ و اشاعت میں پوری سرگرمی سے مشغول رہنے کی تاکید کروں، پھر مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ سے اس کی یاد دہانی اور تاکید کا خاص اثر ہوگا، مجھے آپکی مساعی جمیلہ اور خداداد توفیق سے بڑی امیدیں ہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ سے زیادہ اپنے بندوں کو نفع پہنچائے، مسلمانوں کے عقائد واخلاق کی اصلاح ہو اور برادران وطن انسانیت کی عظمت اور ذمہ داری اور اس کے بارے میں اسلام کی رہنمائی اور کردار کی قدر و قیمت سے واقف ہوں، امید ہے کہ آپ ان اہم کاموں کی تکمیل اور اس پیغام کے پہنچانے میں پوری سرگرمی، اعتماد علی اللہ اور جانفشانی سے کام لیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ آپ کو اپنی رضا اور قرب سے نوازے گا۔''

جب مولانا پاریکھ صاحب نے ان کی ہدایت کے مطابق اس کام کی طرف کامل توجہ کی تو حضرت مولاناؒ کو بڑی تسکین ملی اور انہوں نے تحریر کیا کہ میں بہت سارے کاموں میں

مشغول رہتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ کام پوری تیزی وتندہی سے جاری رہنا چاہئے۔

مورخہ: ۹-۶-۱۹۷۶ء خط نمبر: ۷

''یہ معلوم کرکے بڑی تسکین ہوئی کہ آپ نے ''پیام انسانیت'' کے کام اور پیغام کو جاری رکھا اور اس طرح میری بے عملی اور تعطل کی کسی حد تک تلافی ہوئی، اس سلسلہ میں مجھے آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔''

ایک خط میں مولاناؒ نے اپنے دو اہم ابتدائی و بنیادی رفقائے کار کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے پاریکھ صاحب کو بھی اس کی جانب پوری توجہ مبذول کرنے کی تاکید کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

مورخہ : ۲۸-۶-۱۹۷۶ء خط نمبر:۳۸

''اس سفر میں مرادآباد میں بھی کچھ کام ہوگیا، مولوی اسحاق صاحب اور ڈاکٹر اشتیاق صاحب ساتھ تھے۔ ہم تینوں نے ''پیام انسانیت'' کے موضوع پر خطاب کیا، امید ہے کہ آپ اس مسئلے کی طرف متوجہ رہیں گے۔''

مولانا پاریکھ صاحب شروع ہی سے خدمت قرآن پر متوجہ رہے ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ قرآن مجید، آسان لغات القرآن، درس قرآن کی مجلسیں اس کی گواہ ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے اس کی برابر تحسین کی لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ تاکید بھی کی ''پیام انسانیت'' کا کام بھی بہت اہم ہے اور یہ بھی ہدایت وسعادت کی نئی راہیں کھولنے والی ہے، انہوں نے تحریر فرمایا:

مورخہ : ۶-۸-۱۹۷۶ء خط نمبر :۹

''پیام انسانیت'' کا کام آپ پوری دلجمعی سے کریں، کیا عجب ہے کہ اس سے ہدایت وسعادت کی کوئی نئی راہ نکل آئے۔''

حضرت مولانا کا فکر ارجمند دل دردمند سے جڑا ہوا تھا۔ جب بھی انسانیت کی توہین کی جاتی حضرت مولانا بے چین ومضطرب ہو جاتے اور اپنے اثرات کا استعمال کرتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ کسی بھی طرح انسانوں کو مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ جمشید پور کے خونریز فسادات کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

مورخہ : ۲۱-۴-۱۹۷۹ء خط نمبر: ۳۱

’’جمشید پور کے واقعہ نے دل کو زخمی کردیا ہے، شاید آپ کو اس سنگینی کا حال معلوم ہوا ہو، یہ معلوم کرکے تعجب بھی ہوا اور کوفت بھی کہ بالا صاحب دیورس حادثہ سے چند دن پہلے وہاں موجود تھے، میں نہیں کہہ سکتا کہ حادثہ اور ان کے دورہ اور تقریروں میں کوئی ربط اور رشتہ تھا یا نہیں اس لئے کہ بغیر تحقیق کے کوئی بات نہیں کہنی چاہیے، اور اس کے قرائن ووجوہ بھی موجود ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی صاحب ضمیر اور ذی شعور انسان اس طرح کے واقعات کو پسند کرسکتا ہے اور اس کا دل اس پر خون کے آنسو نہیں روئے گا، آپ سے ان کے حالات اور خیالات کا جو علم ہوا اس سے تو میں توقع کرتا تھا کہ ان جیسا کوئی پڑھا لکھا اور شریف انسان جہاں جائے گا وہاں اگر فساد ہونے والا بھی ہوگا تو اس کا خطرہ جاتا رہے گا۔

دنیا کی کوئی حکومت یا کوئی تہذیب اس ظلم وبربریت کے بعد پنپ نہیں سکتی، اور رب العلمین جو ارحم الرحمین بھی ہے، کبھی اس کو مہلت نہیں دے سکتا، یہ وہ نکتہ ہے جس پر دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاقی فلسفہ متفق ہیں۔

آپ اپنے طور پر ان سے ملئے اور ان کے ضمیر کو ٹٹولیئے کہ ان کو خود بھی
اس واقعہ پر افسوس اور نفرت ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے، تو ان سے بھی اور
پوری ہندو تہذیب اور فلسفہ اور انسانیت کے مستقبل سے بھی مایوسی ہے،
میں نے سیوان کی تقریر کا ہندی ترجمہ جس کا عنوان ہے "جب پڑھے
لکھے انسان پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے" کہ نسخوں کی ایک تعداد آپ کے
نام بھیجوائی ہے، اگر آپ کسی بہانے سے یہ تقریر ان کو پوری سنا سکیں یا وہ
آپ کے سامنے پڑھ لیں تو اس کی ضرور کوشش کیجئے، تجربہ ہے کہ بعد
میں کوئی پڑھتا وڑھتا نہیں، وعدہ کر لیتے ہیں پھر فرصت نہیں ملتی۔"

حضرت مولاناؒ 'تحریک پیام انسانیت' کو ہندوستانی سماج کے مظلوم افراد کے لئے واحد حل اور علاج تصور کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ظلم پسند اور متکبر لوگوں کے پتھر دلوں میں اگر کوئی جونک لگ سکتی ہے تو بس اسی تحریک کے ذریعہ لگ سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

مورخہ : ۳۰-۴-۱۹۷۹ء خط نمبر: ۳۲

"اس قوم کا ضمیر جس طرح مفلوج ہوا ہے بلکہ ظلم پسند اور متکبر ہو گیا ہے
اس سے بہت کم امید ہوتی ہے کہ اس پتھر میں کوئی جونک لگ سکے لیکن
پھر بھی کوشش کرنا فرض ہے، میرے خیال میں اس سب کا علاج "پیام
انسانیت" کی تحریک کو زور شور سے چلانا ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق
دے کہ عوام تک خود پہنچ کر ان کو ان سنگ دلوں کے نرغہ سے نکالیں۔"

حضرت مولانا ندویؒ کا خیال تھا اس ملک کو فرقہ وارانہ فسادات سے محفوظ رکھنے اور اس میں انسانی ہمدردی کی خوشگوار فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے ساتھ خواص سے بھی رابطہ قائم کیا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی آرام

گاہوں سے باہر نکل کر لوگوں تک امن وشانتی اور باہمی اتحاد واتفاق کا پیغام پہنچائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا ندویؒ نے اپنی تمامتر معروفیات کے باوجود متعدد لوگوں سے اس سلسلے میں ملاقاتیں کیں اوران کے ساتھ 'پیام انسانیت' کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ اگر کبھی وہ خود نہیں جاسکے تو اپنے اہم ساتھیوں کو اس مہم پر روانہ کیا۔ ایسی ہی ایک مہم کا تذکرہ اس خط میں ملتا ہے:

مورخہ : ۳-۵-۱۹۷۹ء خط نمبر :۳۴

''آپ نے بہت صحیح اور مکمل ترجمانی کی۔ بہت اچھا کیا کہ آپ نے میری وہ بات من وعن نقل کردی کہ بغیر تحقیق کے ہرگز کوئی بات کہنی نہیں چاہئے۔ اس کا نفسیاتی اثران پر ایسا پڑا کہ ان کا دل بات سننے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنا جس طرح دفاع کیا میں اس سے مطمئن نہیں ہوا، انہوں نے براہ راست ہنگامہ کرنے اور قتل وغارت گری کے لئے کچھ نہ کہا ہو، لیکن ان جیسے بااثر لیڈر کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ان کے جانے سے وہاں فضا بجائے درست ہونے کے خراب ہوجائے اوراس میں فساد کی صلاحیت اورامکان پیدا ہو۔

میں تو اللہ کی ذات سے امید رکھتا ہوں کہ ہم لوگ ''پیام انسانیت'' کے سلسلہ میں جہاں بھی جائیں گے اور ہماری تقریریں ہوں گی تو مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی فساد کے لئے آسانی سے تیار اور مفسدین کے لئے آلہ کار نہیں بن سکیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعوت وتلقین میں انسانیت کے احترام کا جزء اورانسانی جان ومال کے قدر وقیمت کے اظہار کا حصہ نہیں ہے، صرف احیائیت اور فسطائیت کا رنگ غالب ہے،

اس کو جس انداز میں بہتر سمجھیں کسی آئندہ ملاقات میں ان کے گوش گزار ضرور کردیں اوران دونوں کا فرق واضح کردیں۔

اتنی بات تو شاید وہ بھی تسلیم کرلیں، کہ ان کا دورہ فضا کو درست کرنے اور انسانیت کا احترام پیدا کرنے میں ناکام رہا آپ ان سے برابر رابطہ رکھئے اور کسی وقت ذرا مل کر یہ معلوم کرنے کی کوش کیجئے کہ انہوں نے ہمارے ہندی کے رسائل بالخصوص ''جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے'' کا مطالعہ کیا یا نہیں؟''

'پیام انسانیت' کے کام میں حضرت مولانا ندویؒ کے سب سے پہلے اور اہم ساتھی مولانا اسحٰق جلیس مرحوم تھے، جب انہوں نے داغ مفارقت دی تو مولانا پاریکھ صاحبؒ کو ہدایت کی کہ اب انہیں اس کام کے لئے پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر اس ملک کی کشتی کو ساحل سے ہمکنار کرنا ناممکن ہے۔مولاناؒ نے تحریر فرمایا:

مورخہ : ۸-۴-۱۹۸۰ خط نمبر : ۳۹

''اب حالات ایسے ہیں کہ آپ کی پوری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ یہ ملک سنبھالا نہ جاسکے گا اور مسلمانوں کا کوئی مقام نہ رہے گا، مولوی اسحٰق جلیس صاحب مرحوم کی یاد دل میں چٹکی لیتی رہتی ہے، قاضی عدیل عباسی صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے، اب آپ جلد سے جلد اپنے کو فارغ کرنے کی کوشش کریں اور میں ''پیام انسانیت'' کا کام بالکل آپ کے حوالہ کردوں۔''

حضرت مولاناؒ اپنی گوناگوں علمی و دعوتی مصروفیات کے باوجود کبھی اس تحریک سے غافل نہیں ہوئے۔وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی پوری سنجیدگی سے توجہ دیتے

تھے۔ ہر معاملے کو گہری نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے تعلق سے اپنا قیمتی مشورہ ضرور دیتے تھے۔اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت مولانا کی نظر میں یہ ایک ایسا کام تھا جس کے ذریعہ نہ صرف انسانی فضا کو شیطانی آلودگیوں سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا بلکہ اذہان کی تطہیر اور قلوب کے تصفیہ کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔

حضرت مولانا کا یہ خط اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے:

مورخہ : ۳-۷-۱۹۸۱ء خط نمبر: ۵۳

''آپ نے حفظ ماتقدم کے طور پہ جو انتظام کیا وہ بہت مناسب تھا، اخباروں میں مکوانا صاحب کے دورہ کی جو رپورٹ آئی ہے اور خود ان کا جو بیان انگریزی، اردو اخبارات میں شائع ہوا ہے وہ برا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی فضا میں ان کی گفتگو ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس انتظام کے لئے بروقت جنوب میں بھیج دیا۔آپ کی احتیاطیں اور ہدایتیں سب معقول اور ضروری ہیں۔

سرنگاپٹنم میں آپ کی تقریریں، گفتگوئیں اور اس سے بڑھ کر آپ کا قیام یقیناً مفید رہا ہوگا اس کا اطمینان ہے۔الحمد للہ کہ میسور میں پیام انسانیت کے کام کی مزید تشکیل ہوگئی، اس وقت وہیں کچھ منظم شکل ہے یا بنگلور میں ہے، ان دونوں مقامات کی طرف بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔میسور میں آپ نے جو خواب دیکھا وہ بہت معنی خیز اور مبارک ہے، موت اور دفن کو صوفیائے کرام نفس کے پنجہ کے ڈھیلے ہونے اور فنائیت کی دلیل سمجھتے ہیں اور یہی تعبیر لیتے ہیں۔

اچھا ہوا کہ اس سفر میں مدراس بھی جانا ہوگیا، تقریب ہجرت کے لئے

جابجا سے دعوت نامے آئے ہیں، جن میں الجزائر (Algeria) کا ابھی باقی ہے، ابھی اندازہ نہیں ہے کہ اس کا کیا زمانہ ہوگا اور اس وقت کیا حالات ہوں گے؟

اب ایک ایسے مرکز کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے جہاں نئے مہمانوں کو رکھ کران کی دینی تربیت کی جاسکے۔ اس مرکز اور اس کے حصول کے ذرائع اور اس کا ذمہ دار کون ہوگا، یہ سب باتیں بہت غور وفکر اور زبانی گفتگوؤں کی محتاج ہیں۔ اب کی آپ کی آمد پر یہ خاص موضوع رہے گا۔"

حضرت مولاناؒ کو تحریک کے ابتدائی ایام میں اس کا شدید قلق تھا کہ عوام اور خواص کا ایک طبقہ بھی اس کام کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے سے قاصر ہے اور وہ اسے اپنی کم علمی و نادانی سے معمولی کام تصور کرتا ہے۔ مولاناؒ ایک خط میں اسی کرب کا اظہار کرتے ہوئے اپنے رفیق کار کو اس کام کی طرف پوری توجہ وانہماک سے مشغول رہنے کی تاکید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

مورخہ : ۲-۱۰-۱۹۸۲ء خط نمبر: ۶۹

"شاید ہی کوئی اور اس کی اہمیت وضرورت سمجھتا ہو آج نہیں تو کچھ عرصے بعد لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کام میں مسلمانوں کی تاخیر کتنی سنگین نتائج کی حامل اور زریں موقع کھونے کے مترادف ہے، مسلمان سیکولر حکومت میں انہیں خطوط پر ملک کو بھی بچاسکتے ہیں اور اپنے دین کا بھی جھنڈا بلند کرسکتے ہیں، یالیت قومی یعلمون۔

محمد سعید درگاہی صاحب نے عرصہ ہوا خط لکھا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس وقت کچھ کام کرنے والے موجود تھے اب اگر آپ ان کی صلاحیت

اور اس کام سے ان کی مناسبت کے بارے میں مطمئن ہوں تو "پیام انسانیت" کا مرکزی دفتر ان کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب آپ سے ملاقات کے بعد طے ہوگا، جس کی اب سخت ضرورت ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ وسط نومبر میں مجھے عزیزی یحیٰ سلمہ (فرزند مولوی معین اللہ صاحبؒ) کی شادی میں اندور جانا ہے۔ مولوی معین اللہ آپ کی شرکت کے بھی متمنی ہیں۔ اب آپ کی وہاں سے قرابت بھی ہوگئی ہے۔ وہ آپ کو صحیح تاریخوں کی اطلاع دیں گے۔ آپ وہیں آجایئے، انشاءاللہ ضرور گفتگو ہو جائے گی۔ قاضی عبدالحمید صاحب بھی ہوں گے۔

نئے مہمانوں کے لئے تربیتی مرکز کے قیام کا بھی فیصلہ کرنا ہے وقت گزرتا چلا جارہا ہے اب تاخیر کی گنجائش نہیں۔

مراٹھی اور گجراتی میں ترجمہ کا کام بھی تیزی سے ہونا چاہئے، اس سلسلے میں مزید تاخیر ہوئی تو مواخذہ کا اندیشہ ہے۔"

مولاناؒ نے اس تحریک کے مقاصد کی اشاعت کے لئے ہمہ جہت کوششیں کی تھیں، انہیں میں سے ایک غیر مسلموں بالخصوص غالی رہنمایان مذاہب کے نام بھی ایسے مطبوعات کی ترسیل تھی جن کے ذریعہ ان کے فکر و ذہن کی اصلاح کی جاسکے اور انہیں لوگوں کو لڑانے کے بجائے لوگوں کو ملانے کے کام پر لگایا جا سکے، یہ خط اسی کی تائید کرتا ہے۔

مورخہ : ۸-۲-۱۹۸۴ خط نمبر : ۷۹

"ہم نے اپنے کنیڈی ہال علی گڑھ کی تقریر کے کچھ نسخے انگریزی، ہندی آپ کے پاس بھجوائے تھے کہ آپ دوستوں کو اور آر ایس ایس کے

لیڈروں کو دے سکیں، تا کہ ان کو معلوم ہو کہ مسلمان کس طرح سوچتا ہے اور اس ملک کا کتنا درد رکھتا ہے؟ امید ہے کہ آپ نے پہنچانے کی کوشش کی ہوگی، انشاء اللہ "پیام انسانیت" کے سارے لٹریچر آپ کو بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔"

مولانا اس تحریک کے لئے اس لئے بھی بے انتہا متفکر رہتے تھے کہ وہ اس کام کو اس ملک میں رہتے ہوئے اپنا اہم ترین فریضہ تصور کرتے تھے۔ وہ اس ضروری کام کو بہر حال انجام دینا چاہتے تھے۔ یہ خط پیام انسانیت کے لئے ان کی فکر مندی کا کھلا ثبوت ہے :

مورخہ : ۳-۹-۱۹۸۴ء خط نمبر :۸۶

"ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ہمیں آپ کو جلد بیٹھ کر غور کرنا چاہئے کہ ہم ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں؟ اللہ نے مسلمانوں کو پھر ایک بار انسانیت، اخلاق واصول اور ملک و معاشرے کو بچانے کا پیغام دینے کا زریں موقع عطا فرمایا ہے۔"

'تحریک پیام انسانیت' کے کاموں کے تعلق سے ان کی بے چینی اس خط میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

مورخہ : ۱۹-۴-۱۹۸۷ء خط نمبر :۱۰۸

"ملک کے حالات بڑے تشویشناک اور قابل توجہ ہیں۔ ہمارے نزدیک راستہ وہی ہے جو پیام انسانیت کے جلسوں اور آخر میں حیدر آباد کے تعلیمی اجلاس کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ ہمارے آپ کے اور ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے ملنے اور تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے، اگر آپ دہلی کسی وجہ سے نہیں آرہے ہیں تو اپنی خیریت سے مطلع

کریں۔اور عید کے بعد جلد ملنے کی کوشش کریں۔"

'تحریک پیام انسانیت' سے مولاناؒ کو قلبی لگاؤ تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس کے جلسوں کی کامیابی انہیں مسرور کردیتی تھی اور وہ اس کام میں تعاون کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔یہ خط ملاحظہ ہو:

مورخہ : ۹-۵-۱۹۸۷ خط نمبر : ۱۱۰

"آپ نے حیدرآباد کی تقریب کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے ایسی خوشی ہوئی جو عرصہ سے اس سلسلے میں نہیں ہوئی تھی، میں نے دہلی سے آنے کے بعد ہی سید جمیل الدین صاحب کو مبارکباد اور شکریہ کا خط لکھا تھا۔ ابھی ان کا جواب نہیں آیا، اصل چیز دارالمطالعہ کا قیام ہے جی چاہتا ہے کہ ہر مرکزی شہر میں ایسے دارالمطالعہ قائم ہو جائیں اور اس میں مجلس کے لٹریچر کے ساتھ "پیام انسانیت" کا بھی لٹریچر ہو۔"

حضرت مولاناؒ اگر کبھی اس تحریک کے کسی پروگرام کے لئے اپنی معروفیت یا علالت کے سبب وقت نہیں نکال پاتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ مولانا پاریکھ صاحبؒ اس میں ضرور شرکت کریں تا کہ 'پیام انسانیت' کا کام بہتر طور پر انجام پاسکے۔ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے تحریر فرمایا تھا:

مورخہ : ۱۳-۹-۱۹۸۹ء خط نمبر : ۱۲۰

"اس وقت تکلیف دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ایک کرم فرما مولوی محمد قاسم صاحب ندوی چمپارن میں "پیام انسانیت" کا ایک جلسہ ۲۰/۱۹ /اکتوبر کو (گو آپ چاہیں تو کچھ تاخیر سے) رکھنا چاہتے ہیں۔وہ مجھے دعوت دینے رائے بریلی آئے ہوئے ہیں لیکن میری صحت اس کی

متحمل نہیں کہ حیدرآباد سے واپسی کے چند دن بعد چمپارن کا سفر کروں، ممکن ہے آرام کے لئے حیدرآباد سے محمد بھائی کے ساتھ ہفتہ عشرہ کے لئے بمبئی چلا جاؤں، میں نے ان کو آپ کو زحمت دینے کا مشورہ دیا ہے اور کہا ہے کہ اس موضوع پر آپ سے بہتر بولنے والا مشکل سے ملے گا۔ اب میں یہ خط انہیں کے سامنے لکھ رہا ہوں۔ عرصہ کے بعد بہار میں یہ پہلا جلسہ ہو رہا ہے، ۱۵، ۱۶ برس ہوتے ہوں گے جب سیوان میں ایک جلسہ ہوا تھا، اس ریاست میں اس کی خاص طور پر ضرورت ہے، امید ہے کہ آپ ان کی خواہش کی تکمیل فرمائیں گے اور میری فرمائش کی۔"

حضرت مولاناؒ نے بالخصوص جن لوگوں کو اس کام پر مامور کیا تھا اگر وہ کبھی ان کی طرف سے غفلت و کوتاہی محسوس کرتے تو فوراً ان کو اس کام پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ اس کام کو ہر حال میں انجام دینا لازمی تصور کرتے تھے۔ بطور نمونہ یہ خطوط ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں:

مورخہ : ۴-۵-۱۹۹۰ء خط نمبر : ۱۳۲

"پیام انسانیت کی تحریک کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔ کنونشن کے نتیجہ میں ایک کمیٹی بن گئی ہے، پانڈے صاحب اس کے صدر ہیں، ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے، قاضی عبدالحمید صاحب اور انیس چشتی صاحب دہلی سے جانے کے بعد بالکل خاموش ہیں ان کو بھی متحرک کرنے کی ضرورت ہے، جو آپ ہی بہتر طریقہ پر کرسکتے ہیں۔"

☆

مورخہ : ۲۰-۱۲-۱۹۹۰ء خط نمبر : ۱۳۷

"اسلام کے تعارف کے لئے "پیام انسانیت" کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ قاضی عبدالحمید صاحب انیس چشتی وغیرہ کو بھی وقت فارغ کرنے کی ضرورت ہے۔ وقت کا یہ اہم ترین فریضہ ہے۔"

☆

مورخہ : ۲۵-۶-۱۹۹۱ء خط نمبر : ۱۴۳

"انتخاب کے نتائج نے (بالخصوص اپنی ریاست یوپی میں) دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمائے اور حالات کو غیب سے سازگار بنائے، یہ وقت خاص طور پر "پیام انسانیت" اور اسلام کے تعارف کرانے کا ہے، ہم نے انیس چشتی صاحب کو بلایا ہے۔ آپ لکھنؤ کے لئے جلد وقت نکالیں اور کام کا نقشہ بنے۔"

☆

مورخہ : ۳-۶-۱۹۹۴ء خط نمبر : ۱۷۷

"آپ بنگلور جاسکیں تو ضرور تشریف لے جائیں۔ راج شیکھر جی کو کسی حال میں مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ وہ برابر اپنا کام کرتے رہیں۔ امبیڈکر جی کے صاحبزادہ کو بھی اسی لائن پر لگانا چاہئے۔ یہی اس وقت کا تقاضہ اور علاج ہے، اور آپ ہی اس کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔"

حضرت مولاناؒ سمجھتے تھے کہ یہ ملک جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں اور اس کی کمان ان مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے جو مساوات ورواداری کو جزو ایمان تصور کرتے ہیں، اس ملک کے لئے جمہوریت، نامذہبیت اور عدم تشدد کی راہیں

اختیار کرنا ہی مناسب ہے، ورنہ ٹکراؤ اور فساد لازمی ہے، اور بحیثیت مسلمان اس پیغام کو عام کرنے کے لئے بہترین راستہ یہی 'تحریک پیام انسانیت' ہے۔اس خط میں مولانا اسی خیال کو تحریر کرتے نظر آتے ہیں:

مورخہ : ۱۰-۳-۱۹۹۸ء خط نمبر : ۲۰۶

''ملک کا جو سیاسی اور انتظامی مستقبل نظر آرہا ہے وہ عمومی طور پر ملک کے لئے خصوصی طور پر ملت اسلامیہ کے لئے بڑا اندیشناک اور تشویش انگیز ہے۔جن قائدین نے ملک کے لئے تین اصول اور شرطیں مقرر کی تھیں وہ بڑے حقیقت پسند اور دور بین تھے۔ایک یہ کہ اس ملک کی قیادت، آزادی اور بقا کے لئے تین شرطیں ہیں: (۱) جمہوریت (۲) نامذہبیت (۳) عدم تشدد۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک ان تینوں کی پابندی کے بغیر قلیل مدت تک بھی نہیں چل سکتا۔ یہاں فوراً Civil War شروع ہو جائے گی۔اس وقت حقیقت کے اعلان کی بڑی ضرورت ہے۔''

حضرت مولانا کی تحریک رنگ لائی اور ان کی کوششوں سے جب لوگ اس طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے اس پر اپنی مسرت کا ظہار بھی کیا اور ایک دوسرے کو مبارکباد بھی پیش کی۔ملاحظہ ہو آخری دور کا یہ خط:

مورخہ : ۱۸-۱۱-۱۹۹۸ء خط نمبر : ۲۱۷

آپ گیا کے ''پیام انسانیت'' کے اجلاس میں تشریف نہ لا سکے، اس کی کمی محسوس ہوئی، اجلاس بڑا کامیاب رہا، اتنا بڑا جلسہ ابھی تک ''پیام انسانیت'' کا کہیں اور نہیں ہوا۔ستر بہتر ہزار افراد کی شرکت تھی، بارہ تیرہ ہندو لیڈر اور تنظیموں کے ذمہ دار بھی اسٹیج پر تھے ان میں کئی نے

تقریریں کیں۔ اتنی تعداد نمائندگی کے لحاظ سے جلسہ بہت کامیاب تھا،
آپ کو بھی مبارک ہو۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو اس تحریک سے جو لگاؤ تھا اور جس کی خاطر وہ شب و روز فکر مند رہا کرتے تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

مورخہ : ۳۰-۱-۱۹۸۱ء خط نمبر : ۴۵

''اس سفر سے پہلے آپ سے ملنے کا تقاضہ تھا کہ ''پیام انسانیت'' کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرلوں، مگر اب امید نہیں معلوم ہوتی کہ آپ سے سفر سے پہلے ملاقات ہو سکے گی، ۳/فروری کو بظاہر انشاء اللہ لکھنؤ سے روانگی ہے، اس وقت تک شاید خط ہی پہنچے۔

پیام انسانیت کے علاوہ ایک آدھ اور ذمہ داریاں آپ کے سپرد کرنی تھیں جن کے لئے دل میں تقاضا پیدا ہو رہا ہے اس سفر میں آپ سے تعلق میں اور اضافہ ہی ہوا، اب طبیعت پر تقاضا ہے کہ مرکز کا قیام جلد ہو جائے۔

''پیام انسانیت'' کا کام جتنا بھی پھیلے آپ رہنمائی کے ساتھ اس کی ہمت افزائی کرتے رہیے۔ مارچ میں واپسی کے بعد دیکھیں گے، اگر بمبئی سے ناگپور آنا ہو جائے تو زیادہ آسان ہوگا۔''

☆

مورخہ : ۱۴-۳-۱۹۸۱ء خط نمبر : ۴۷

''پیام انسانیت'' کے لئے آپ کے مشورہ سے پیام بنانا ہے، اور کم سے کم ایک دورہ جلد کرنا ہے، اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قبولیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کردی۔''

☆

مورخہ : ۱۴-۶-۱۹۸۲ء خط نمبر : ۶۶

"پیامِ انسانیت" کے سلسلہ کے جلسوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مدد ہو رہی ہے اس سے زیادہ کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ مہمانوں کا سلسلہ بھی جاری رکھے، اور ان کی خبر گیری ہو سکے، ملاقات پر انشاء اللہ "سیجعل اللہ بعد عسر یسرا" پر گفتگو ہو جائے گی۔"

☆

مورخہ : ۶-۷-۱۹۸۲ء خط نمبر : ۶۷

"پیامِ انسانیت" کے دورہ کی کامیابی سے مسرت ہوئی، لیکن آپ نے جو دو عزیزوں کے نام لکھے ان سے دل پر چوٹ لگی، اس کام سے ان دونوں کو صحیح مناسبت تھی۔

☆

مورخہ : ۱۵-۱۲-۱۹۸۷ء خط نمبر : ۱۱۴

"پیامِ انسانیت" کا کام تو اس وقت تنہا آپ ہی کر رہے ہیں افسوس ہے کہ اس کی ابھی تک ضرورت و اہمیت نہیں سمجھی گئی "فستذکرون ما اقول لکم وافوض امری الی اللہ" (۴۰۔المومن۔آیت ۴۴) کے حسب حال ہے۔ میں رات ہی اعظم گڑھ سے واپس ہوا، لوگوں نے بتایا کہ "قومی آواز" میں آپ کی اور راجیو جی کی ایک ساتھ تصویر شائع ہوئی ہے، حافظ کرامت صاحب بڑے اصرار سے بلا رہے تھے، لیکن ہم سفر کے بالکل قابل نہیں تھے، انہوں نے بڑا اچھا انتخاب کیا۔ خدا کرے کہیں تقریر کا خلاصہ بھی آیا ہو، انشاء اللہ اس کا ضرور فائدہ ہوگا۔"

☆☆☆

عارف عزیز (بھوپال)

مفکر اسلام کی فکر ونظر تقاریر کے آئینہ میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا شمار دنیا کی بلند پایہ علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت مفکر، مدبر، مصلح، قائد، زمانہ شناس ادیب، نباضِ وقت اور خطیب تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں فہم وفراست اور حکمت وبصیرت کے بڑے حصہ سے نوازا تھا۔ اس لئے دورِ حاضر کے تقاضے اور نفسیات کے مطابق وہ دین وشریعت پیش کرنے کا کام اپنے قلم اور زبان سے لیا کرتے تھے۔ دنیا کے جس گوشے میں جاتے وہاں دل کی گہرائیوں سے اسلام کا پیغام لوگوں کو سناتے، خاص طور سے عالم عرب اور اسلامی ملکوں میں لوگوں کو یاد دلاتے کہ تمہارے گھر سے دیئے گئے پیغام کی بدولت ہندوستان میں ہمارے آباواجداد اسلام لائے اور آج ہم جب اسلام لانے کی قیمت ادا کر رہے ہیں تو تم محو خواب ہو۔ حضرت نے عرب ممالک میں پاکستان کے اس پروپیگنڈہ کا بھی رد کیا کہ ہندوستان میں اب مسلمان نہیں رہ گئے، جو تھے وہ پہلے پاکستان منتقل ہوگئے یا بعد میں ماردیئے گئے۔ انہوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ عربوں کو اس خوبی سے متعارف کرایا کہ اس سے پہلے کوئی دوسرا یہ کام نہیں کرسکا۔ وہ ہمارے عہد کے واحد ہندوستانی تھے جو عربوں کو ان کی زبان اور ان کے لہجہ میں بغیر کسی مرعوبیت کے مخاطب کرتے تھے۔ اور ایسی فصیح عربی بولتے و لکھتے تھے کہ اہل عرب بھی اس کے سحر میں

کھو جاتے، اس میں تنقید و احتساب کی دعوت کے ساتھ طاقت و توانائی حاصل کرنے کی راہ بھی دکھاتے، ان کے دکھ درد میں شریک رہتے، ان کے غم پر آنسو بہاتے اور بارگاہ الٰہی میں دعائیں بھی کرتے۔ عرب قومیت کا گمراہ کن نعرہ ہو یا فلسطین پر اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ اس کے خلاف زبان و قلم سے جہاد چھیڑ کر حضرت نے واضح الفاظ میں عربوں کو متنبہ فرمایا کہ اسلامی صلاحیت اور دینی حمیت کا مطلوبہ معیار پورا کئے بغیر وہ قیادت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ عربوں کو جو بھی عزت نصیب ہوئی، وہ اسلام اور محمد عربی ﷺ کا فیض ہے، یہ سرمایہ اگر عربوں سے چھن جائے تو ان کے پاس کچھ باقی نہیں بچے گا۔ اسی طرح فلسطین کے مسئلہ کو انہوں نے عربوں کا نہیں اپنا مسئلہ سمجھا، اس پر تقاریر کیں اور کتاب لکھی، مسئلہ فلسطین کے اسباب و عوامل بیان کئے اور حل کے لئے راہ دکھائی، بارہا اپنی تحریر و تقریر میں فرمایا کہ عربوں کے اس زوال و پستی کی بنیادی وجہ ان کے یقین کی کمزوری، شک و شبہ کا نفوذ اور احساس کمتری ہے۔ کویت اور سعودی عرب کی یہ تقریریں "عالم عربی کے المیہ" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں نہایت بے باکی اور دلسوزی کے ساتھ عربوں کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں کی زبوں حالی، فکری انارکی، ابن الوقتی اور چھوٹے معیار کے آگے سپر اندازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح انہوں نے پاکستان پر اسلامی تہذیب کے تحفظ اور صحیح عقیدہ کی ضرورت واضح کی اور وہاں کے حکمرانوں کو اسلامی حکومت کے آداب و اطوار سمجھائے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت نہ صرف دانائی و دور اندیشی سے عبارت تھی۔ بلکہ حق پرستی و جرأت کا بھی اعلیٰ مظہر تھی، انہوں نے حق گوئی سے گریز کر کے تلخ حقائق کے اظہار پر مصلحت اندیشی کا غلاف کبھی نہیں چڑھایا بلکہ باطل کے خلاف کھل کر آواز بلند کی، افغانستان تشریف لے گئے تو مغربی ثقافت کی "برکات" اور مستشرقین کے افکار و

نظریات سے دامن بچانے کی ضرورت واضح کی، ایران گئے تو شیعہ وسنیوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا مشورہ دیا، ہندوستان میں بھی شیعہ سنیوں کے مسلکی اختلافات کو امت کے رِستے ہوئے ناسور سے تعبیر کیا اور اس کے تدارک میں پیش پیش و فکر مندر ہے۔

حضرت مولانا نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبے دیئے، ان میں مسلمانان ہند کے لئے جہاں پرسنل لا کو ناگزیر بتایا، وہیں اسے مسلمانوں کی عزت اور آبرو کے لئے اہم قرار دیا اور اس کی حفاظت کو اسلامی تہذیب وتشخص کے تحفظ سے تعبیر فرمایا۔ حضرت کے خطبات وتقاریر مختلف عنوانات کے تحت کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک اہم مجموعہ ''پا جا سراغ زندگی'' ہے، ان تقریروں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کو وہ یہ پیام دیتے ہیں کہ ''شاخ ملت انہی کے دم سے ہری ہو سکتی ہے''۔ امریکہ کے سفر پر گئے تو وہاں کی یونیورسٹیوں اور مجلسوں میں جو تقریریں کیں ''مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں'' اور ''نئی دنیا'' کے نام سے وہ منظر عام پر آگئی ہیں۔ ان تقاریر میں حضرت مولانا نے دوٹوک انداز میں فرمایا کہ: ''امریکہ میں مشینوں کی بہار تو دیکھی، لیکن آدمیت اور روح کا زوال پایا۔'' وہاں کے مسلمانوں کو تعلق باللہ، اپنے کام میں اخلاص اور انابت کی روح پیدا کرنے پر زور دیا۔ یہی پیغام وہ ہر جگہ ہر ملک اور ہر شہر میں دیتے رہے، جو نیا نہیں تھا۔ لیکن کچھ ایسے ایمانی ولولے، قلبی درد اور داعیانہ انداز میں اس کا اعادہ کرتے کہ سننے والوں کے قلوب گرما جاتے۔ اسی طرح یوروپ، برطانیہ، سوئزرلینڈ اور اسپین کی یونیورسٹیوں اور علمی مجلسوں میں تخاطب کے دوران یہ پیام دیا کہ ''وہاں کے مسلمان مغربی تہذیب وتمدن کے گرویدہ نہ ہوں۔ کیونکہ اس کا ظاہر روشن اور باطن تاریک ہے۔ مسلمان اس سرزمین پر اسلام کے داعی بن کر

رہیں، اسلام کی ابدیت پر مکمل اعتماد رکھیں اور مشرق ومغرب کے درمیان نئی نہر سوئز تعمیر کرنے کے لئے کام کریں۔"

حضرت مولاناؒ نے ملی مسائل کے حل کے لئے بھی جو بن پڑا اس سے دریغ نہیں کیا، دینی تعلیمی کونسل ہو، مسلم پرسنل لا بورڈ یا پیام انسانیت کا پلیٹ فارم سب کا استعمال مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اور ان کے حقوق کی بازیابی کے لئے کیا، بالخصوص "پیام انسانیت" کے ذریعہ جہاں برادران وطن کو ایک مہذب انسان اور ذمہ دار شہری بننے، اپنے اندر وسعت نظر اور وسعت قلبی پیدا کرنے کا درس دیا، وہیں مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھیں، اس کی رنگا رنگ تہذیب کے ماننے والوں کے ساتھ شرافت و انسانیت کا سلوک کریں، مل جل کر رہیں، ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی کشتی کا سوار تصور کرکے باہم معاملہ کریں، اس تحریک کا مسلمانوں کو اچھا پھل یہ ملا کہ اکثریت کے حلقوں میں فرقہ ورانہ ہم آہنگی قائم ہوئی اور گرم فضا کو معتدل بنانے میں مدد ملی۔ حضرت نے ہندوستان کی خوابیدہ ملت کو جگانے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ شہر شہر، قریہ قریہ اپنی تقریروں کے وسیلہ سے یہ بتایا کہ دنیا پر خود غرضی اور بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، اسے چادروں سے نہیں روکا جاسکتا لیکن انسانیت کا درد محسوس کرکے اور اپنے ملک کو نمونہ بنا کر اس صورت حال پر ضرور قابو پایا جاسکتا ہے، ان تقریروں کے مجموعے "پیام انسانیت"، "تحفۂ انسانیت" اور "تحفۂ دکن" کے نام سے طبع ہوئے اور انسانیت کا یہ پیغام زندگی کے آخری مرحلہ تک وہ لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ سرگرم سیاست سے دور رہے، لیکن وطن کی محبت اس کی بھلائی اور ترقی کی فکر نے انہیں ہمیشہ بے چین رکھا۔ "پیام انسانیت" تحریک بھی گویا ایک نسخۂ کیمیا تھی، جس کے ذریعے وہ قوم وملت کو مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کا احترام

کرنے کا درس دیتے تھے۔ اس کی بنیاد اگرچہ ایک تقریر کے ذریعہ ۱۹۵۴ء میں رکھی گئی، لیکن عملی طور پر اس تحریک کا آغاز ۱۹۷۴ء سے ہوا اور زندگی کے آخری مرحلہ تک ان کا اس سے والہانہ لگاؤ رہا۔ ملت اس تحریک کی معنویت کو سمجھے اور اس کے پیغام پر توجہ دے تو آج بھی تعصب و تنگ نظری کی دیواریں منہدم ہو سکتی ہیں اور بحیثیت انسان مسلمانوں کے لئے دوسروں کا درد و تکلیف سمجھنا آسان ہو جائے گا، اس موضوع پر حضرت مولانا علی میاںؒ نے جو تقریریں فرمائیں ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کے مصداق نہایت مؤثر ہیں، ان تقاریر میں ان کے دل کا درد اور فکر کی روشنی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ عوام سے خطاب ہو یا طلباء سے گفتگو اہل علم سے درد دل کہہ رہے ہوں یا حکام و امراء کو نصیحت فرمارہے ہوں، سب کو وعظ و نصیحت کے بجائے آئینہ دکھانے پر وہ یقین رکھتے تھے اور سننے والے اس آئینہ میں اپنی صورت و سیرت کی کمزوریوں، اپنے دل و دماغ کی کوتاہیوں کا مشاہدہ کرتے جاتے تھے، اس بالواسطہ ترسیل سے حضرت نے وہ کام لیا جو زورِ خطابت اور جوش بیان سے نہیں ہو سکتا تھا، اسی طریقہ نے عوام الناس سے اہل علم تک سب کو متاثر کر کے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ان تقریروں کو پڑھنے سے ایک منضبط تحریک کی خوبی نظر آتی ہے، جو دماغ سے زیادہ دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ قرآنی آیات و احادیث کی روشنی میں، بزرگوں کی سیرت و سوانح کے حوالے سے حضرت مولاناؒ جو فرماتے وہ سامع کے دل میں اتر جاتا اور وہ زبان حال سے پکار اٹھتا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عارف اعظمی عمری

ادب برائے اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نقطۂ نظر

دنیائے ادب میں لفظ و معنی کی بحث نہایت قدیم ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ حسن بیان معنی کے اثر و نفوذ کا وسیلہ و ذریعہ ہے اور معنیٰ سے خالی تعبیر و لفظ اس خوش نما پھول کے مشابہ ہے جس میں خوشبو نہ ہو، ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ تہذیب جدید کے علم برداروں نے ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے لفظ و معنی کی قدیم کش مکش کا خاتمہ کیا، جس کے نتیجے میں اصناف ادب کی متنوع جہتیں وجود میں آئیں۔

مگر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سیل رواں نے تہذیب وثقافت اور تمدن و مذہب کی اقدار کو غیر معمولی نقصان پہونچایا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ طبقہ علماء کے وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے "خذ ما صفا و دع ما کدر" (جو عمدہ ہو اس کو لے لو اور جو گدلا ہو اس کو چھوڑ دو) کے اصول کے مطابق اس نئے ادبی انقلاب کو ایک صالح، مثبت اور تعمیری سمت دینے کی کوشش کی۔ اور اسی ضرورت کے تحت انہوں نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کی جو اس وقت دنیائے علم و ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ عصر حاضر میں ادب اسلامی کی ضرورت کس قدر شدید ہے اس کا اندازہ حضرت مولاناؒ کے ایک خطبہ کے اقتباس سے

لگایا جاسکتا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

"ہم اس صورت حال سے بالکل ناواقف ہیں جس سے آج کا نوجوان گزر رہا ہے۔ اگر بوڑھوں اور نوجوانوں، مبلغین اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے ختم ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان اس دعوت سے متاثر، اس کے مقاصد سے مطمئن اور اس کو فروغ دینے کے لئے سرگرم عمل نہ ہوں، لیکن اس کے لئے بہت نازک، گہری اور باریک علمی منصوبہ بندیوں کی ضرورت ہے، ایک نئے لٹریچر کی ضرورت ہے، نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لئے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت ہے۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس نقطۂ نظر کے پرجوش مبلغ اور داعی تھے کہ لفظ کی دلفریبی و دل آویزی، رعنائی و سحرانگیزی، تفہیم معانی کا موثر وسیلہ ہے اور اسلام کے عہد اول سے اس کا رشتہ استوار ہے، وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے کہ رشتۂ ادب سے صرف نظر کرنا اسلامی دعوت کو صدمہ پہنچانے کے مترادف ہے، اپنے اسی خطبہ میں نہایت پردرد لہجہ میں فرماتے ہیں:

"ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض محترم اور فاضل علماء زبان و ادب پر عبور حاصل کرنے اور زور بیان اور دل نشین اسلوب پیدا کرنے کو فضول، غیر ضروری اور بالکل ضمنی چیز سمجھتے ہیں، ان چیزوں کو ہمارے علماء اپنے فرائض سے علیحدہ اور اپنے راستہ سے انحراف سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے خود اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے، اور ہم سب کا اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب

سے بے نیاز ہے، لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی کتاب کو ایک معجز
اسلوب اور عربی مبین میں نازل فرمایا۔"

حضرت مولاناؒ نے یہ خطبہ اردن کی ایک علمی مجلس میں دیا تھا۔ اس میں انہوں نے اسلامی دعوت کے فروغ میں ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ماضی کے واقعات کا موثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان، اسلوب اور بلاغت کا پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، اور جب ہم دعوت وعزیمت اور تجدید واحیائے دین کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ و برگزیدہ شخصیات جو اخلاص، انقطاع الی اللہ اور ربانیت صادقہ کے عروج پر تھیں انہوں نے کبھی اس پہلو کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ اس طرف پوری توجہ کی اور اس پر پورا زور دیا، ہم اس موقع پر نبی کریم ﷺ کی مثال تو نہیں پیش کرنا چاہتے کیونکہ آپ بالاتفاق اور بغیر کسی شک وشبہ کے فصیح ترین اور بلیغ ترین انسان تھے، البتہ ہم حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جو بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور اسی طرح تاریخ اسلام کی آخری صدیوں تک نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جن شخصیات کو بھی اسلامی دعوت وتحریک میں قیادت کا منصب حاصل رہا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے زور بیان، مخاطب کی نفسیات کی فہم اور فصاحت وبلاغت کا بہرہٴ وافر عطا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جب میں سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے خطبات پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ وہ شخص جو ساری دنیا میں اور ہر دور میں اپنے زہد، قناعت، ربانیت، اور تقویٰ کے

لئے مشہور رہا ہے، وہ عالم اسلام کے دارالحکومت اور عباسی خلافت کے مرکز بغداد میں جہاں حریری، ابن الجوزی اور صابی پیدا ہوئے، جہاں بحتری، شریف رضی، متنبی، ابوتمام اور معرّی نے نغمہ سنجیاں کیں، وہی شخص اپنے اس معاشرہ کو ایک سحر انگیز انداز بیان میں مخاطب کرتا ہے ایسے انداز میں جو دلوں کی گہرائیوں میں اترتا ہے، اور جسکی تاثیر اور طاقت آج بھی موجود ہے، اسی تاثیر کے پیش نظر حضرت جیلانیؒ کے خطبات جمع کرنے والوں نے کوشش کی ہے کہ بعینہ ان کے الفاظ بھی ہوں ورنہ اگر معنوی روایت ہوتی تو یہ خطبے اپنی تاثیر بڑی حد تک کھودیتے۔"

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، ص:۲۶۲ تا ۲۶۷)

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک دعوت دین کے لئے ادب کے سرمایہ کو مفید اور ضروری سمجھتے تھے، عروس البلاد ممبئی علم و ادب کا مرکز ہے بالخصوص ترقی پسند تحریک نے اسی شہر میں جنم لیا اور اس کے نامور ادباء و شعراء نے ممبئی کو اپنا وطن بنایا، اس پس منظر میں رابطہ ادب اسلامی کے اسٹیج سے حضرت مولاناؒ کے ادبی موقف کو متعارف کرانے کے لئے یہ سیمنار بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس ضمن میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ حضرت مولاناؒ کے اس نظریاتی موقف کا دائرہ محض عربی زبان و ادب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ادبیات عالم کو ایک صحیح اور مثبت رخ دینے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے اردو اور فارسی زبان کے عظیم مفکر شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کا تعارف عربی زبان میں کرایا۔

حضرت مولاناؒ نے اپنے خطبہ اردن میں عصر حاضر کے علماء اور مصلحین کو جو پیغام

دیا ہے اس کو اس موقع پر نقل کرنا موزوں ہوگا، وہ فرماتے ہیں:

"اگر ہم نوجوانوں کی صحیح اور گہری اسلامی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہم کو نئے علمی وادبی اسلحہ سے مسلح ہونا پڑے گا، تیاری کرنی ہوگی ان تمام شرطوں کو پورا کرنا ہوگا جو ہر زمان ومکان کے لئے ہیں اور جو آج بھی اپنی قیمت، اہمیت اور اثر رکھتی ہیں یعنی ایک ایسا علمی اور اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہوگا جو نوجوانوں کے ذہن سے قریب ہو جوان کو اپیل کرے، جسے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو بلکہ وہ اس کو پڑھنے کے لئے بے چین اور بے قرار ہوں، اگر تم نے یہ شرطیں پوری کرلیں تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان صرف یہی نہیں کہ اس نظریہ پر ایمان لائیں گے بلکہ اس کو عام کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کریں گے اور اس کے لئے جان کی بازی لگادینے سے دریغ نہ کریں گے۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس پیغام کو ہر طبقہ اور حلقہ میں عام کرنے کی ضرورت ہے، علماء، دانشورانِ ملت اور مصلحین قوم کو اس جانب متوجہ کرایا جائے کہ وہ ادب کو دعوت اسلامی کا ایک وسیلہ سمجھیں، اور اس کے اقسام واصناف سے واقفیت پیدا کریں۔ اسی طرح ممبئی جو اپنی گوناگوں صفات کے ساتھ جدید خیال کے ادباء اور شعراء کا بھی مسکن ہے۔ ہمیں یہ پیغام اس حلقے تک بھی پہونچانا ہوگا۔ کیا عجب کہ اقبالؔ کے اس مصرعہ کی تعبیر ہاتھ آجائے۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

☆☆☆

مولانا عبدالقدیر قاسمی

مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریریں

ایک ادبی جائزہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت گوناگوں اوصاف وکمالات کی حامل تھی، مصنف، داعی، رہنمائے قوم اور خطیب کی حیثیت سے اگر آپ کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بیسویں صدی میں مولانا علی میاں کو ہندوستان اور عالم اسلام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور جس قدر آپ کے افکار و خیالات اور جذبۂ دروں سے علماء اور عوام یکساں طور پر متاثر اور مستفید ہوئے اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر آپ خلاقانہ قدرت رکھتے تھے اور آپ نے دونوں زبانوں کو اپنی تصنیف وتالیف، تقاریر، خطبات اور خطوط کا میدان بنایا یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام سے عرب بھی اتنے ہی متاثر ہوئے جس قدر برصغیر ہندوپاک کا اردو طبقہ۔ ان کی ادبی لیاقت اور زبان دانی کی توصیف عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، ماہرالقادری اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکرحسین جیسے ادب شناس افراد نے بھی کی ہے۔ مولانا نے اگرچہ تاریخ، سیرت اور مذہب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی زبان اور آپ کی تحریر میں ادبی چاشنی اور فکر کی گیرائی و گہرائی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ آپ کی تحریر قاری کے قلب ودماغ پر جادو کی طرح اثر کرتی ہے، جس

طرح آپ کی تحریر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتی ہے کہ پڑھنے والا وجد وسرور پر مجبور ہوجاتا ہے، اسی طرح آپ ایک اچھے خطیب تھے اور آپ کے خطبات ان اندرونی افکار و خیالات کی عکاسی کرتے ہیں جو طویل تجربہ، قرآن وحدیث کے مطالعہ، امت کی تاریخ کے نشیب و فراز اور دید وشنید کے ذریعہ انہیں حاصل ہوئے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، وہ صدیوں سے مذہب واخلاق، رشد وہدایت تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان صفات کی جلوہ گری، ان کی شخصیت اوران کی تحریر وتقریر میں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اور شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ اس میدان میں جو مقام بلند مولانا کے حصے میں آیا، وہ ہندوستان کے کسی دوسرے عالم دین کے حصہ میں نہیں آسکا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو چیزیں خاندانی اور موروثی طور پر آپ کے ذہن ودماغ میں مرتسم تھیں، حالات وواقعات اور آپ کی ہمہ جہت شخصیت نے اس کو اور جلا بخشی یہاں تک کہ وہ ادبی، علمی اور تصنیفی صلاحیت مختلف سطحوں پر اس طرح نمایاں ہوئی کہ جس شخص نے بھی پڑھا یا سنا، اس کو اپنے دل کی آواز سمجھا۔

مولاناؒ نے اپنے علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارناموں سے تمام دنیائے علم وادب کے باذوق افراد کو متوجہ کیا، صرف سولہ سال کی عمر میں "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" مضمون کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جسے علامہ سید رشید رضا نے نہ صرف اپنے معروف مجلہ "المنار" میں شائع کیا بلکہ اسے ایک علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی طبع کروایا۔ اس بارے میں خود مولاناؒ رقمطراز ہیں:

"اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم کا کیا اعزاز ہوسکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں، تھوڑے عرصے میں

"ترجمة الامام السيد احمد بن عرفان الشهيد" کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آ گیا اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی، میری عمر اس وقت سولہ سال کی رہی ہوگی، یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی۔"

(کاروان زندگی، اول ص:۱۱۹)

علامہ اقبالؔ حضرت مولانا علی میاںؒ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ان سے بے انتہا تعلق اور انسیت کی یہ کیفیت تھی کہ سولہ سال کی عمر میں ان کی نظم "چاند" کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور جون ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ان سے ملاقات کے موقعے پر انہیں اپنا یہ عربی ترجمہ دکھلایا تو وہ خود حیرت زدہ رہ گئے۔درحقیقت حضرت مولاناؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار وخیالات میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے، علامہ اقبال کے متعلق مولانا خود فرماتے ہیں:

"میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیار بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس وآفاق کے لئے ابھارتا ہے۔میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ (علامہ اقبال) اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت اور وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی تھے۔"

(نقوش اقبال، ص:۳۳، ۳۴)

مولاناؒ کی بے شمار تصانیف ہیں جنہیں علمی وادبی حلقوں میں بے انتہا مقبولیت حاصل

ہوئی۔ انہی میں ایک تصنیف "کاروان مدینہ" بھی ہے، جو حضرت مولانا ہی کی کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ ہے۔ مولانا کی اس کتاب کا ہر ہر جملہ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہے "مشتے نمونہ از خروارے" چند جملے پیش ہیں:

"حضور ﷺ کی پیدائش کا دن مبارک کیوں نہ ہو اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی عطا کی:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انہی کی لگائی ہوئی ہے

یہ دنیا کوئی خود رو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے اور انسان اس باغ کا سب سے اعلی پھول ہے، یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایا ہے، انسان کے جوہر انسانیت کا اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا۔"

(کاروان مدینہ)

کسی ادیب کی ادبی کتاب پر اسی کا تبصرہ قابل قبول ہوتا ہے، جو بذات خود ادیب و ناقد ہو اور ادب کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہو، چنانچہ حضرت مولانا کی معروف کتاب "مختارات" کے متعلق ممتاز عالم دین و بلند پایہ ادیب علامہ سید علی طنطاویؒ نے خود لکھا ہے:

"اگر کسی ادیب کے ذوق کا اندازہ اس کی پسند سے کیا جاسکتا ہے تو ہمارے قارئین کے علم میں یہ بات لانا کافی ہوگا کہ ابھی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ ادبی منتخبات کے متعدد مجموعوں کا ہم نے جائزہ لیا تا کہ ان میں سے کسی ایک مجموعہ کا شام (سوریہ) کے مدارس شرعیہ کے ثانوی

درجات کے لئے منتخب کریں، اس کمیٹی کے تمام ممبران نے ان مجموعات کی چھان بین شروع کی، واضح رہے کہ اس کمیٹی کے تمام ہی افراد ادباء ہیں، تلاش وجستجو اور بحث وتفتیش کے بعد ہم سب نے متفقہ طور پر ان تمام منتخبات میں سے ایک مجموعہ نثر عربی کا پسند کیا، وہ ہے مختارات مرتبہ شیخ سید ابوالحسن علی ندویؒ۔''

(تعمیر حیات، خصوصی شمارہ، ص:۱۱۶)

مولاناؒ کے خطبات ان کے ذہنی وفکری تخیلات وافکار کے آئینہ دار ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں سجاد لائبریری سے منسلک طلباء کی ایک انجمن نے ۱۹۵۴ء میں مولانا علی میاںؒ کو دارالعلوم تشریف آوری کی دعوت دی تاکہ طلباء مولانا کے زریں افکار وخیالات سے مستفید ہوں۔ اس موقع پر مولانا نے جو خطبہ دیا اس کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، مولانا نے فرمایا:

''دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت وفراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے آرام حرام ہے، اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون ووقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود وتعطل کی گنجائش کہاں؟ اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بہکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے، یا کسی منزل پر قیام

کرے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے؟ سرودازلی اور پیغام محمدیؐ اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی کسی منزل پر قیام خودکشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے اور کوئی خودشناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔"

(کاروان زندگی، اول، ص: ۴۰۳)

پیام انسانیت کا قیام درحقیقت ملک میں ایک معتدل فضاء قائم کرنے کی طرف ایجابی قدم تھا، اسی لئے مولانا نے ایک جگہ تحریر فرمایا کہ:

"بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی و بے اثری کا پورا احساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلاتفریق مذہب و ملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

چنانچہ مولاناؒ نے اسی پلیٹ فارم سے ہندوستان کے طول وعرض میں سینکڑوں خطبات دیئے اور اسی سلسلے میں ضلع سیوان میں آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے، ۷۷ء کی ۱۴ رجولائی کو جب میں امریکہ ہی میں تھا، نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہوکر انسانوں کی جان لے لے، اس لئے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے جیسا کہ جمشید پور، راوڑ کیلا اور رانچی میں ہوا، ایک ہی کالج میں پڑھانے والے استاد

دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے طالب علم طالب علم کی مخبری کرے اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے۔“

(کاروان زندگی، دوم، ص:۱۱۲)

اسی پلیٹ فارم سے دوسرے موقعے پر آپ نے خطبہ کے دوران فرمایا:

”وہ تعلیم سب کچھ کرتی ہے مگر آدمی کو آدمی نہیں بناتی، انسان اندر سے بنتا ہے باہر سے نہیں بنتا، ہم نے اندر کو بھلا دیا، ہم نے اندر کے انسان کو نہیں جگایا، ہمارے اس انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے، وہ اندر کا انسان ہے، وہ دل والا انسان ہے، وہ ضمیر والا انسان، وہ خدا سے ڈرنے والا انسان ہے، جب وہ انسان جاگ جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے، بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، لیکن اس کا حال کیا ہوتا ہے، وہ قوم کے پیسہ کو، ملک کے پیسہ کو خدا کی امانت سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے پوری قوم مالک ہے اور میں اکیلا خادم۔

میں انسانیت کو سویا ہوا سمجھتا ہوں، مرا ہوا نہیں سمجھتا، انسانیت سو بار سوئی سو بار جگائی گئی، آیئے ہم سب مل کر سوئی ہوئی انسانیت کو جگائیں، پہلے خود جاگیں پھر دوسروں کو جگائیں، سویا ہوا سوئے ہوئے کو نہیں جگا سکتا، ایک جاگتا ہوا سینکڑوں سوئے ہوؤں کو جگا دیتا ہے لیکن سو سوئے ہوئے ایک سوئے ہوئے کو بھی جگا نہیں سکتا۔“

(کاروان زندگی، دوم، ص:۱۳۰، ۱۲۱)

جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا اور لسانی و علاقائی عصبیت کے نتیجے میں مسلمانوں کو مسلمانوں ہی نے تہ تیغ کیا اور ایسی نازیبا حرکتیں کیں جو اسلامی تعلیمات بلکہ انسانی

اخلاق وشرافت کی بھی منافی تھیں، تو اس موقعے پر کلکتہ کے ایک عظیم اجلاس میں ۲۳؍مئی ۱۹۷۲ء کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک قدیم اسلامی ملک اور مسلمانوں کی خالص اکثریت والے علاقے میں جو علماء اور مشائخ اور مدارس اور خانقاہوں کی سرزمین تھی، جس کے چپہ چپہ پر مسجدیں اور خانہ خدا تھے، جس کے لئے صدیوں اولیائے کرام نے آب دیدہ اور خون جگر بہایا اور جس کی زمین ان کے آنسوؤں سے نم اور جس کی فضاء ان کے نالہائے نیم شبی سے گرم تھی، زبان وتہذیب کے جنوں کی ایک تیز وتند لہر اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے صدیوں کی محنت پر پانی پھر گیا، مسلمان نے بے تکلف مسلمان کا گلا کاٹا، بے گناہ انسان اس طرح مارے گئے جیسے سانپ اور بچھو مارے جاتے ہیں اور ان پر کوئی رحم نہیں کھایا گیا۔ جن لوگوں نے اس ملک میں پناہ لی تھی ان کے لئے اب اس ملک میں کہیں پناہ نہ تھی، نہ کسی دل میں ان کے لئے رحم کا جذبہ تھا، نہ کسی آنکھ میں ان کے لئے کوئی آنسو، انسانوں کا شکار اس طرح کھیلا جا رہا تھا، جیسے کسی جنگل میں درندوں، پرندوں کا اور کسی تالاب و دریا میں مچھلیوں کا کھیلا جاتا ہے، نہ شریف عورتوں کی عصمت محفوظ رہی، نہ بوڑھوں کے بڑھاپے پر ترس کھایا گیا، نہ معصوم بچوں کی چیخ پکار پر کان دھرے گئے، بھوک پیاس کا عذاب، سنگ دلی اور شقاوت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو اپنے بھائیوں کے لئے روا نہ رکھی گئی۔''

(ایضاً ص: ۱۳۲، ۱۳۳)

عالم عرب کے ایک سفر میں مولانا رباط تشریف لئے گئے، وہاں علماء کبار اور عمائدین شہر کے ایک بڑے مجمع کے سامنے مولانا نے جو خطبہ دیا وہ مولانا کے اسلام پر کامل یقین اور عالم اسلام سے ان کی واقفیت کی بین دلیل ہے، آپ نے فرمایا:

> "پیغمبر اسلام کا معجزہ محض سلبی نہ تھا، ایجابی اور تعمیری تھا، اس نے اگر چند کتب خانوں پر (جو اپنی افادیت کھو چکے تھے) خط تنسیخ پھیرا تو انسانیت کو اس سے کہیں زیادہ عظیم و وسیع کتب خانے، دانش کدے اور طاقتور عالمگیر تحریک عطا کی جس کی نظیر کسی امت کی تاریخ میں نہیں ملتی، پھر تفصیل سے علوم کی دنیا میں نبوت محمدیؐ نے جو انقلابی کردار ادا کیا اس پر روشنی ڈالی اور عرض کیا کہ اس کے انقلابی کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے انسانی علوم کی متفرق اور بعض اوقات متضاد اکائیوں میں وحدت اور تعاون و اشتراک کا رشتہ پیدا کیا، اس کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم سے اشتغال کرنے والوں کو اس ذہنی حصار سے جس میں وہ ہزاروں برس سے محصور تھے، علمی زندگی کے میدان میں نکالا اور ان کو بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی پر آمادہ کیا۔"

(ایضاً، ص:۲۳۵)

دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اس موقعے پر ہندوستان کے طول و عرض سے جاں نثاران دار العلوم نے دیوبند کے لئے رخت سفر باندھکر اپنی جاں نثاری کا اس طرح ثبوت دیا جس طرح پروانہ شمع پر اپنی جاں نچھاور کر دیتا ہے، ہندوستان کی تاریخ میں کسی تعلیمی درسگاہ کا اتنا بڑا اور اس قدر دلفریب منظر چشم فلک نے نہیں دیکھا، اس موقع پر عالم عرب اور عالم اسلام کے چوٹی

کے علماء نے اس اجلاس صد سالہ کو رونق بخشی، اپنے خطبات سے سامعین کو محظوظ کیا اور بانیان دار العلوم، اس کے مخلص ذمہ داروں اور بے لوث کارکنوں کو اس بات پر تہنیتی کلمات کہے کہ انہوں نے اپنے اخلاص و شب و روز کی محنت کے ذریعہ دار العلوم دیوبند کو کم از کم برصغیر کی ایسی مایہ ناز درسگاہ بنادیا کہ جس طرف محض نسبت بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ اسی موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ نے جو خطبہ دیا، اس کا ہر لفظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، مولانا نے فرمایا:

"آج ملک خودکشی کے لئے قسم کھاچکا ہے۔ وہ آگ کے خندق میں گرنے کے لئے تیار ہے، وہ بداخلاقی اور انسانیت کشی کی دلدل میں ڈوب رہا ہے۔ آپ ہی ہیں جو ہندوستان کیا، پورے ایشیا میں کسی ملک کو بچاسکتے ہیں، آپ اللہ و رسول کی بات کہیئے، آپ کو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں اور اپنا سودا کرانے لگیں کہ بولی بولی جائے، آپ متاع نایاب ہیں، اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کرسکتا، اس لئے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں (کاش میں آپ کے دلوں اور دماغوں پر بھی چوٹ لگاسکتا) کہ اس ملک کو تنہا آپ بچاسکتے ہیں، اس لئے کہ آپ کے پاس عقیدہ توحید اور انسانی مساوات کا اصول ہے، آپ کے پاس اجتماعی عدل کا مکمل نظام موجود ہے، آپ ہی ہیں جو ہر چیز سے بالاتر ہیں، آپ ہی ہیں جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے، آپ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نظر طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے اور جن کی نگاہ میں مال و متاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے۔"

(ایضاً، ص ۳۰۹)

حضرت مولانا علی میاںؒ علماء کرام اور فضلاء مدارس کی کردار سازی پر ہمیشہ خصوصی توجہ

فرماتے تھے اور علماء کو ان کا منصب جلیل اور مقام عالی یاد دلاتے تھے۔ تاکہ وہ امت مسلمہ کی قیادت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکیں، ۱۴/اکتوبر ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد میں علماء کرام، فضلاء مدارس، اور دینی اداروں کے ذمہ داروں کی ایک بڑی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گذارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی اور وہ دعوت واصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے اور اتنا ہی نہیں ہوگا بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہوجائے گا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انہوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اُگل کر باہر پھینک دیا اس لئے کہ انہوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی۔

آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ اگر مسلمانوں کو سوفی صد تہجد گذار بنادیں،

سب کو متقی و پرہیزگار بنادیں لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جارہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی، وبا اور طوفان کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہورہی ہے تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد، پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہوجائے گا، اگر آپ نے دینداروں کے لئے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی اور ان کو ملک کا بے لوث، مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے تو آپ یاد رکھیئے کہ عبادات ونوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہوجائے، اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے ان کی آنکھیں بند رہیں، اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، عوام کے دل ودماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر امۃ کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہوجائے گی۔"

(ایضا،ص:۳۷۲،۳۷۳)

اگر مولاناؒ کے خطبات کا ادبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات یقینی طور پر محسوس ہوتی ہے کہ وہ زبان وبیان پر پوری دستگاہ رکھتے تھے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ترکیب، ایجاز واطناب، اجمال وتفصیل اور استعارات و

کنایات کے استعمال میں ایک ادیب وانشاء پرداز کی طرح دسترس رکھتے اور بحر فصاحت وبلاغت کے شناور تھے، عموماً آپ ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جو اپنے مدلول پر اچھی طرح چسپاں ہوں، اور سامع کے فکر ونظر اور قلب ودماغ کو جھنجھوڑ دے، آپ کی تقریر مثل صاعقہ کڑکتی اور ابر باراں کی طرح برستی۔

حضرت مولاناؒ اپنی زبان دانی اور تقریر کے نشیب وفراز کے ذریعے قلب ودماغ کو جس طرح چاہتے، استعمال کرتے تھے، ان کی تقریر ہنستوں کو رلاتی اور رونے والوں کو ہنسنے پر مجبور کردیتی تھی۔ موضوعات کے اعتبار سے وہ اپنی تقریر میں الفاظ کے استعمال پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اسی طرح جب بھی خطبہ دیتے تو اس میں اپنے طویل تجربہ کا نچوڑ، بلکہ اپنا دل سامعین کے سامنے پیش کردیتے، کیونکہ مولانا جو حقائق بھی سامنے رکھتے، بذات خود ان مراحل سے کئی بار نہیں، بلکہ سینکڑوں بار گذر چکے ہوتے تھے۔

☆☆☆

ہے مسئلۂ جاں پیچیدہ میرا
ہونٹوں پہ چڑھا وصف حمیدہ میرا
دو دن کی زندگی خدا خیر کرے
پڑھتے ہیں احباب قصیدہ میرا

رئیس الشاکری ندوی

محمد زید، مظاہری، ندوی

مفکر اسلام کے خطبات کی چند خصوصیات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اللہ تعالیٰ کے ان خوش نصیب بندوں میں سے تھے جن کو علماء ربانیین اور نائبین رسول کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے، آپ ان تمام اوصاف سے متصف تھے جو ایک نبی کے وارث اور جانشین میں ہونے چاہئے۔ آپ کا شمار چوٹی کے ادباء وفصحاء میں کیا جاتا ہے، آپ کے خطبات وتقاریر کی بہت سی خصوصیات ہیں جو دوسرے واعظین ومقررین کے خطبات سے آپ کو ممتاز کرتی ہیں، بلاشبہ وہ خصوصیات ایسی ہیں جن سے اس نوع کا کام کرنے والوں کو فائدہ اٹھانا چاہئے، وہ درس عبرت بھی ہیں اور قابل تقلید نمونہ بھی، ہم صرف چند خصوصیات کا یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔

قرآنی بنیاد

حضرت مولاناؒ کے خطبات کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ چونکہ حضرت مولاناؒ کو قرآن پاک سے خصوصی مناسبت اور ایک خاص ذوق حاصل تھا جس کا اظہار آپ کے خطبات میں بکثرت ہوتا تھا، اور اسی کا اثر تھا کہ آپ اپنی تقریر کی بنیاد عموماً کسی قرآنی آیت ہی کو بناتے تھے، بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ خالی الذہن ہوتے، جلسہ میں قاری جو رکوع

تلاوت کرتا آپ کا ذہن اسی آیت کے مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا اور اسی کو آپ اپنی تقریر کا موضوع بنا لیتے، آپ امت کو جو پیغام دینا چاہتے اور جس امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتے اس میں خاص طور پر کسی آیت سے ایسے انوکھے انداز سے استدلال فرماتے کہ عام طور پر لوگوں کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچتا، مثلاً ''اصلاح معاشرہ'' ایک موضوع ہے جس کے دائرہ میں سیکڑوں باتیں آتی اور کہی جاتی ہیں لیکن حضرت مولاناؒ نے اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں قرآن کی روشنی میں ایسی بنیادیں اور ایسے اصول اخذ کئے اور بیان فرمائے جو آپ ہی کا حصہ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

لا خیــر فــی کثیــر مـن	ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی
نـجـواهـم الا مـن أمـر	نہیں، ہاں اس شخص کی مشورت اچھی ہو
بـصـدقة أو مـعـروف أو	سکتی ہے جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں
اصلاح بین الناس	میں صلح کرنے کو کہے۔

آپ غور کریں گے تو یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر ایک صالح معاشرہ قائم ہو سکتا ہے، نمبر ایک 'صـدقـه' جب تک کہ ایک دوسرے کے ساتھ عملی ہمدردی نہ ہوگی، مدد کا جذبہ سینہ کے اندر کارفرما نہ ہوگا، اور وہ ایثار نہ کرے گا، کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔

نمبر دو 'أو مـعـروف' معروف بھی قرآن مجید کا ایسا لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ بڑا وسیع المعنیٰ، یعنی معقول و مستحسن بات، جو چیز عرف میں داخل ہے اور جس کو فطرت سلیم رکھنے والے سب بالاتفاق ''اچھا'' کہتے ہیں، اس کا جو حکم دے اب ہر جگہ الگ الگ ہوگا، یہاں معروف یہاں کے لحاظ سے ہوگا دوسرے مقام کا معروف وہاں کے لحاظ سے ہوگا۔

نمبر تین 'او اصلاح بیـن الـنـاس' عام طور پر قبیلوں خاندانوں میں افساد ذات البین کا منظر نظر آتا ہے آپ کے تعلقات کشیدہ ہیں، بستی بستی، گاؤں گاؤں، قصبے قصبے یہ

بیماری پھیلی ہوئی ہے،او اصلاح بین الناس یہ قران ہی کہہ سکتا تھا۔یہ آیت بھی معجزہ ہے، پورا تمدن انسانی پورا معاشرہ انسانی اسی پر قائم ہے۔(تحفہ دین ودانش:ص،۹۱)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا نے تہذیب وتمدن اور صالح معاشرہ کی بنیادیں کس طرح قرآن پاک سے اخذ فرمائیں اس طرح بکثرت نمونے آپ کے خطبات میں پائے جاتے ہیں۔

ادبی خصوصیات

داعی حق اور کامیاب خطیب کے لئے جن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے ان میں ادب وانشاء بھی ہے، باکمال خطیب اور کامیاب مبلغ وہی سمجھا جاتا ہے جسکی خطابت و تبلیغ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادب وانشاء کے پیرایہ میں آسان اسلوب میں ہو، بلاشبہ ادب وانشاء خواہ نثر میں ہو یا نظم میں ایک ایسی قوت اور بڑی نعمت ہے جس سے دعوت وتبلیغ اور دفاع عن الاسلام کا موثر انداز میں کام لیا جاسکتا ہے، اسی لئے جناب محمد رسول ﷺ اپنی بابت ارشاد فرماتے ہیں ''انا اعربکم اناقریشی استرضعت فی بنی سعد'' کہ میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، میں قریشی ہوں، میں نے بنی سعد بن بکر میں پرورش پائی ہے۔'' (سیرت ابن ہشام:ص،۱۶۷ج ا)

شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابتؓ کو آپ ﷺ ممبر پر بٹھا کر کفار کے دفاع اور ان کے اعتراضات کے جواب میں اشعار پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں، ہمت افزائی فرماتے ،اوردعائیں دیتے تھے اس سے ادب وانشاء کی اہمیت (خواہ نثر میں ہو یا نظم میں) معلوم ہوتی ہے۔ (ابوداؤد ص:۶۸۴)

لیکن یہ ایک ایسی قوت ہے جس کا استعمال صحیح طریقہ پر بھی ہوتا ہے اور غلط طریقہ پر

بھی، حقیقی اور اسلامی ادب وہی ہے جو انسان میں بجائے فساد کے صلاح کا مزاج پیدا کردے، ایسا ادب جس سے بجائے تعمیر کے تخریب ہو وہ تخریبی ادب ہے اس سے تباہ کن اور خطرناک حالات پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ادب اور قوت بیانیہ جادو جیسا اثر تعمیر میں بھی رکھتی ہے اور تخریب میں بھی، "ان من البیان لسحرا" کو بہت سے محدثین امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب نے مذمت پر محمول کیا ہے، اور سحر کے ساتھ تشبیہ دینے سے اس کی قباحت و مذمت پر استدلال کیا ہے۔

(قال الباجی وابن عبدالبر قال قوم هذاخرج مخرج الذم لانه اطلق علیه سحرا وهومذموم والی هذا ذهبت طائفة من اصحاب مالك محتجین بانه ادخله فیمایُکره من الكلام (زرقانی شرح مؤطامالك :ص،۵۴۹ج۴)

امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد صعصہ بن صوحان سے اس کی تشریح میں مثال دیتے ہوئے اس کی مذمت ان الفاظ سے نقل فرمائی ہے "فالرجل یكون علیه الحق وهو الحن بالجج من صاحب الحق فیسحر القوم ببیانه فیذهب بالحق" (ابوداؤد:ص،۶۸۴) کہ ایسا شخص جس پر کسی دوسرے کا حق آتا ہو اور یہ شخص صاحب حق کے مقابلہ میں بڑا ادیب فصیح اللسان بھی ہو اپنی چرب بیانی اور قوت بیان سے لوگوں کو مسحور کردیتا ہے اور اس کا حق دبالیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ادب اور فصاحت و بلاغت ایک ایسی قوت ہے جس کے غلط استعمال سے مضر اثرات اور غلط نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے آج کے دور میں جبکہ سارے عالم میں عموماً ادب کا غلط استعمال ہو رہا ہو خواہ نثر میں ہو یا نظم میں، خطابت میں ہو یا صحافت میں جب اس سے بجائے تعمیر کے تخریب کا کام لیا جارہا ہو، تاج

گانے، فحش و بے حیائی کے ناولوں اور گندی خطابت و سیاست میں اس کا استعمال ہورہا ہو جس میں حق کو باطل، باطل کو حق، صلاح کو فساد، فساد کو صلاح، تعمیر کو تخریب اور تخریب کو تعمیر، حلال کو حرام اور حرام کو حلال، سچ کو جھوٹ، جھوٹ کو سچ ثابت کرنے اور ملمع سازی کی بھرپور کوشش جاری ہو جس کو قرآن نے 'زخرف القول' (ملمع سازی، مکروفریب) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے "ان یقولوا تسمع لقولهم كانهم خشب مسندة"۔

ایسے حالات میں ہم زیادہ محتاج ہیں ایسے صالح تعمیری ادب اور ایسے مصلح ادیب کے جس سے ایک طرف تو اس کے مطلوبہ فوائد اور عمدہ نتائج حاصل کئے جاسکیں اور ایک صالح معاشرہ کی تشکیل ہوسکے اور دوسری طرف تخریبی ادب کے غلط اور گندے اثرات کا ازالہ اور مقابلہ بھی کیا جاسکے، جس کے متعلق خود مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''ادب'' ادب ہے خواہ وہ کسی بھی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے اچھی طرح بات کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اسے قبول کرے۔ ہم سطحیت کے عہد میں جی رہے ہیں، ہمارا سابقہ زیادہ تر سطحی ادب سے ہے مگر ہماری اور عصر حاضر کی خاص طور سے عالم عربی کی بڑی ضرورت صالح اور مقصدی ادب ہے جو قوت و زندگی سے بھرپور ہو اور جو بلند و آسمانی ہو اور عالمگیر اسلامی و انسانی پیغام کا حامل و علمبردار ہو، حقیقی، اور فطری ادب بن ہی نہیں سکتا جب تک اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو اور دل کے اندر کچھ درد نہ

ہو۔ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات و میلانات اور عمل، طرز فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے اس لئے وہ بہت مفید بھی ہوسکتا ہے اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی قوت بھی، اسی لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کو تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور تخریب کے لئے بھی اور دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آسکتے ہیں، اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو صحیح رخ پر لگایا جائے، اور اس کے تخریب، انتشارِ خیال اور لذت اندوزی اور نفس پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے اس کو خیر پسندی، صلاح و تقویٰ، ضبط نفس اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے"۔

(تعمیر حیات خصوصی شمارہ: ص، ۴۷ و ۴۹ بحوالہ اقبال وغیرہ)

"ادب" صرف یہی نہیں ہے کہ فصاحت و بلاغت کے معیار کے مطابق بلند کلمات اور فصیح لغات کا استعمال کیا جائے بلکہ حقیقی ادب اور حقیقی بلاغت یہ ہے کہ بات مخاطبین کے فہم اور ان کے عقول کے مطابق ہو، انداز تخاطب ایسا ہو کہ کان اس کے سننے کے مشتاق ہوں، دل اس کے گرویدہ ہوں، طبیعتیں اس سے مانوس ہوں، دل سے نکلی ہوئی بات دل میں اترتی چلی جائے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خطبات پر نظر ڈالیئے تو ایک باکمال خطیب و ادیب اور صالح و تعمیری اور مقصدی ادب میں جو خصوصیات ہونی چاہئے وہ سب آپ کو مولاناؒ کے خطبات میں نظر آئیں گی، مولاناؒ کے خطبات میں ادبی چاشنی، بھی ہے اور فصاحت و بلاغت کی پوری رعایت بھی، مخاطبین کی فہم کے مطابق آسان

اسلوب بھی ہے اور دل میں گھر کر جانے والا انداز بھی، ضرورت کے موقع پر جرأت و بے باکی بھی ہے اور نرمی کے ساتھ حرارت پیدا کرنے والا انداز بھی، کبھی مخاطبین کو جھنجھوڑتے اور تباہ کن حالات اور آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے ہیں اور کبھی امید کی کرنیں دکھلاتے ہیں۔ "کلموا الناس علی قدر عقولھم" کی پوری رعایت ہے، صوفیاء و مشائخ کا مجمع ہو تو انہیں کے مشرب و مزاج کے مطابق گفتگو فرماتے ہیں، حکام و سیاسی لیڈروں کا بھی مجمع ہو تو انداز گفتگو کچھ اور ہوتا ہے، طلبہ و اہل مدارس مخاطب ہوں تو بات انہیں کے کام کی اور اسی انداز کی ہوتی ہے، عوام الناس اور مزدور و ملازم پیشہ طبقہ سے خطاب ہو تو گفتگو انہیں کی سطح کے مطابق ہوتی ہے، الغرض ہر جگہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ موقع و محل اور مخاطب کی رعایت و ضرورت پیش نظر ہوتی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولاناؒ کے خطبات میں ایسے حقائق اور ایسا مواد اور ایسے پیغامات ہیں جن سے صالح معاشرہ کی تشکیل اور بگڑے ہوئے ماحول و معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے نیز فاسد اور تخریبی ادب کے مضر اثرات کا ازالہ بھی۔

مولاناؒ کے خطبات میں مخاطبین کی تفہیم کے لئے تشبیہات و تمثیلات بھی ہیں اور تاریخی حقائق و واقعات اور ان کی روشنی میں اہم پیغامات بھی جن سے کام کا میدان اور طریقۂ عمل سامنے آتا ہے اور پوری رہنمائی اور کافی بصیرت حاصل ہوتی ہے، مولاناؒ کے خطبات کی اس نوع کی خصوصیات کے اقتباسات اور مثالیں اگر ذکر کی جائیں تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے، یہاں پر صرف چند مثالوں اور چند اقتباسات ذکر کیئے جاتے ہیں۔

تشبیہات و تمثیلات

مولاناؒ کے خطبات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت مخاطبین و سامعین

کی افہام وتفہیم کے لئے عمدہ تمثیلات وتشبیہات کا بھی استعمال فرماتے ہیں جس سے مقصد تک پہنچانے اور اپنی بات سمجھانے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور خود سامعین کو اس سے بڑی بصیرت وعبرت حاصل ہوتی ہے، مولانا کا یہ انداز تفہیم بھی اسلوب قرآنی کے موافق ہے، قرآن میں بھی بکثرت مثالوں کے ذریعہ مخاطبین کو حق سمجھایا گیا ہے، کبھی مکھی اور مچھر کی مثال کے ذریعہ، کبھی عنکبوت اور مشرک غلام اور کبھی تر وخشک زمین کی مثالوں کے ذریعہ مختلف انداز سے سمجھایا گیا ہے، یہی اسلوب قرآنی مولانا نے بھی اپنے خطبات میں ضرورت کے وقت اختیار فرمایا ہے، نمونے کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مولانا اپنے ایک خطبہ میں سمجھاتے ہیں کہ مسلمان کے دو وجود اور اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت انسان ہونے کی اور ایک اس کے مسلمان ہونے کی، یہ گویا اس کے دو وجود ہوئے، انسانی وجود کے لحاظ سے وہ عام انسانوں کی طرح ہے اس میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں لیکن دوسری حیثیت یعنی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا مقام اس کی افادیت اور اس کی ذمہ داری کچھ اور ہو جاتی ہے، اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے مثال دی ہے فرماتے ہیں:

> ''اس کی موٹی سی مثال آپ کو دیتا ہوں، یہ ٹارچ ہے اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیئے گئے اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے زمین وآسمان کا فرق ہوگا، یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اجالا کر دے گی، روشنی کا اک تیز دھارا اس میں سے نکلے گا، یہ ہاتھ میں ہوگی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرا جانے سے بچے گا اور معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ بڑی طاقت ہے''۔

اس کے بعد قرآنی آیت سے اس مضمون اور مثال کا انطباق فرماتے ہیں اور پھر آگے چل کر دوسری مثال دیتے ہیں:

''دیکھئے یہ بلب ہے یہ وائرنگ ہے، وائرنگ بالکل صحیح ہے لیکن اس کا پاور ہاؤس سے کنکشن نہیں ہے اور وہ کرنٹ اس میں نہیں آتا تو اگر اس کی وائرنگ آپ ریشم کی کریں اور سونے کے تار لگائیں لیکن کنکشن نہیں ہے، بجلی کی رو اس میں نہیں آرہی ہے تو سب بیکار ہے، روشنی ہے نہ کوئی فائدہ ہے، معاملہ ٹارچ میں سیلز اور مسالہ رکھنے کا ہے، یہ مسالہ بارگاہ نبوت سے ملتا ہے اس کے لئے ایک ہی جگہ ہے وہ سیلز اور کہیں نہیں مل سکتے، نہ امریکہ میں نہ روس میں نہ دنیا کے کسی کارخانہ میں، وہ ایمانی سیلز رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں وہ اگر آپ ٹارچ میں رکھتے ہیں، فٹ کردیتے ہیں تو ذرا سا بٹن دبایئے، ذرا سا ہاتھ کا اشارہ کیجئے اور روشنی کی ایک تیز رَو نکلے گی جس سے آپ کو بھی راستہ نظر آئے گا اور دوسروں کو بھی راستہ نظر آئے گا۔

(تحفہ دین ودانش: ص، ۶۵ و ۶۷)

تاریخی مواد اور واقعات سے استشہاد

''تاریخ'' مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک محبوب مشغلہ اور دلچسپ موضوع رہا ہے، تاریخ پر آپ کی گہری نظر تھی، آپ کا کمال یہ تھا کہ ماضی کی تاریخ اور حال کے واقعات سے استشہاد کرتے، نتائج اخذ کرتے اور حالات حاضرہ پر ان کو منطبق کرتے ہوئے مخاطبین کو جھنجھوڑتے اور خطرناک حالات، تباہ کن نتائج سے امت کو

آگاہ کرتے، یعنی آپ تاریخ اور واقعات سے وہ کام لیتے جو قرآن نے جگہ جگہ واقعات بیان کرکے لیا ہے "لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب" گویا اپنے خطبات میں عبرت و موعظت اور تنبیہ وتہدید کے لئے بھی اسلوب قرآنی اختیار فرمایا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے خطبات میں ماضی کی تاریخ اور واقعات کا عنصر بھی کافی حد تک پایا جاتا ہے، لیکن مولانا کے بیان کردہ واقعات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق اور صحیح واقعات ہیں محض فرضی قصے، لطیفے اور چٹکلے نہیں ہیں جیسا کہ عام طور پر بہت سے واعظین بیان کیا کرتے ہیں۔

مولانا تاریخی حقائق و واقعات کو بیان فرما کر کس طرح مخاطبین و سامعین کو عبرت دلاتے اور جھنجھوڑتے ہیں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے، ایک علاقہ کے روساء وامراء میں مولانا خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

> "ایک بیماری یہ ہے کہ مسلمانوں کا سرمایہ ان کو عزیز ہو گیا ہے اور ملت کے مسائل کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا ہے، صحابہ کرام کا معاملہ جدا تھا ان کو پیسہ کی پرواہ نہیں تھی، صحابہ کرام کو ملت کے مسائل کے سامنے پیسہ عزیز نہ تھا، گھر میں جھاڑو دے کر آتے تھے وہ لوگ، صحابہ کے کئی واقعات آپ لوگوں کو یاد ہوں گے، پھر بھی ایک واقعہ تم کو بتاتا ہوں (اس کے بعد آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد فرماتے ہیں) ہمارا نفس کہتا ہے کہ پیسہ بچائے رکھنا ترقی کرنے کا راستہ ہے لیکن پیغمبر کہتے ہیں کہ یہ ہلاکت کا راستہ ہے، ان کی بات سچی نکلتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم تباہ ہوتے جا رہے ہیں، اتنے بہت سے قارون ہماری قوم میں ہیں، ہر گاؤں میں چار پانچ

قارون بنے ہوئے ہیں لیکن ہماری ملت کی کیا حالت ہے، ہماری ملت کی عزت کیا رہ گئی، ہماری ملت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے، جہاں چاہو فساد کرادو، ملت بے عزت ہوگئی ہے، بے آبرو ہوگئی ہے، میں نے رنگون میں کہا تھا وہ لکھ پتی لوگ تھے، میں نے دیکھا ان میں یہ روگ ہے، میں نے کہا اگر تم تبلیغ میں نہ نکلے، راہ خدا میں نہ نکلے، اگر تم نے اپنے مال میں سے خدا کا حصہ نہ دیا، ملت کے مسائل کے مفاد کے لئے پیسہ نہ دیا تو یاد رکھو تمہاری دو کانوں پر سیل پڑے گی، اور تمہارے مال ضبط کر لئے جائیں گے، اور تمہارا تھوڑا گذارہ لگا دیا جائیگا، اگر دین کے تقاضے پورے نہیں کئے تو خدا تم پر عذاب مسلط کرے گا۔ آپ یقین مانیئے میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں بھول گیا جو کچھ وہاں کہہ کر آیا تھا، اب آیا وہ زمانہ کہ قومی حکومت قائم ہوئی وہاں سے خط آتے تھے وہ خط کیا تھے وہ خط آنسو ہوتے تھے۔ تم نے جب زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خدا ہی نے تم پر ٹیکس مسلط کیا، جو قوم زکوٰۃ کو یعنی خدا کی مقرر کی ہوئی رقم کو روکتی ہے تو اس پر نئے نئے ٹیکس مسلط ہو جاتے ہیں۔"

(ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام: ص، ۱۴۳)

حضرت مولاناؒ کے خطبات میں تنوع اور جامعیت

حضرت مولاناؒ کے خطبات کی بہت بڑی خوبی تنوع اور جامعیت ہے، مولاناؒ کا سابقہ امت کے ہر طبقہ سے پڑتا تھا، اور ہر طبقہ کے لوگ آپ سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے تھے، مولاناؒ کی خوبی اور بڑا کمال یہ تھا کہ ہر طبقہ کے مخاطبین سے ان کے حالات

اور ضرورت کے مطابق ایسے مضامین بیان فرماتے جو واقعی ان کی ضرورت کے ہوتے تھے، گویا دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔

ایک مرتبہ برطانیہ تشریف لے گئے، تبلیغی احباب نے وہاں کے تبلیغی مرکز میں آپ کا بیان طے کر دیا، چنانچہ مولاناؒ نے تبلیغی حلقہ میں بیان فرمایا جس میں اولاً آپ نے تبلیغی کام کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت کو بیان فرمایا، اس کے فضائل وکمالات اور اپنے آپ کا اس سے مربوط ہونا بھی بیان فرمایا، اس کے بعد ان کی ضرورت کا اہم مضمون بیان فرمایا کہ سب کچھ یہی نہیں ہے، اس جیسے ملک میں آپ کو اپنی ذریت اور آنے والی نسل کو بھی فکر کرنی ہے، آپ کا تبلیغی انہماک اور مجاہدات سر آنکھوں پر، بہت قابل مبارکباد لیکن اگر آپ نے اپنی اولاد کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام نہیں کیا، ان کی تعلیم کے لئے آپ نے دینی مکاتب اور مدارس قائم نہیں کئے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ ہماری نسل اسلام پر برقرار رہ سکے گی یا نہیں، الغرض پوری قوت کے ساتھ آپ نے تبلیغی احباب کو مکاتب ومدارس کے قیام پر زور دیا۔

اس کے بعد اسی سفر میں برطانیہ ہی میں اسی دن ایک ایسے دینی مدرسہ میں جو وہاں کا بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا ہے اور مظاہر علوم سہارنپور کے طرز پر قائم ہے، ان کے اکابر واسلاف کی یادگار ہے، اس مدرسہ میں آپ کا پروگرام ہوا، یہاں آپ کے مخاطبین اہل مدارس واہل علم تھے ان حضرات کے سامنے اولاً آپ نے برطانیہ جیسے ملک میں دینی ادارہ قائم کرنے کی اہمیت وفضیلت کو بیان فرمایا، ان کے کاموں اور کارناموں کو سراہا، ان کی ہمت افزائی وقدردانی فرمائی، ان کے اکابر واسلاف کے کارناموں اور مجاہدوں کا ذکر فرمایا اور ان اکابر واسلاف سے اپنے والہانہ تعلق کا بھی اظہار فرمایا اور اخیر میں یہ بات بھی فرمائی گویا ان کو یہ پیغام دیا کہ آپ برطانیہ جیسے انگریز ملک میں

ہیں، ہر جگہ اور ہر ملک کے کچھ حالات اور تقاضے ہوتے ہیں، آپ کو صرف اسی قدیم نہج پر اکتفا نہیں کرنی ہے، آپ کو یہاں کے حالات اور ضروریات اور یہاں کے تقاضوں کو بھی دیکھنا ہے، یہاں کے مسائل کیا ہیں، ضروریات کیا ہیں، اس کے اعتبار سے آپ کو نظام بنانا ہے، ترمیم بھی کرنی ہے، یہاں کے حالات کے مطابق آپ کو سوچنا اور نظام بنانا ہے کہ نوجوان اور انگریزی داں طبقہ تک کس طرح دین پہنچانا ہے، ان سب باتوں کو سوچ کر آپ کو آگے قدم بڑھانا ہے، الغرض وہاں کے اہل علم اہل مدارس کو آپ نے خاص رخ پر موڑا اور کام کرنے کا ایک میدان سامنے کردیا، اس کے بعد اسی سفر میں انگریزی داں طبقہ اور جماعت اسلامی کے لوگوں میں بھی آپ کا بیان تجویز ہوا چنانچہ آپ وہاں بھی تشریف لے گئے اور ان کی ضرورت کے مطابق بیان فرمایا، ان کے کاموں کو سراہا، ان کے کارناموں کی تعریف اور ہمت افزائی فرمائی اور ساتھ ہی اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ دین فہمی اور قرآن فہمی کسی شخصیت پر مبنی ہوگئی اور اب آگے ہم کچھ غور نہیں کرسکتے، اس کے آگے کچھ سوچ نہیں سکتے، جو حدود مقرر کئے جاچکے ہیں وہی آخری حدود ہیں، آگے ہمارے لیئے دروازہ بند ہے، (اشارہ تھا مولانا مودودی صاحب کی طرف) مسائل اور بھی ہیں کسی شخصیت پر فہم کا دروازہ بند نہیں ہوگیا، آپ کو اس کے آگے کچھ اور سوچنا اور کرنا ہے، وہ ساری گفتگو آپ نے خاص ان کے حالات اور مزاج کے مطابق فرمائی تھی، اسی طرح ایک مرتبہ آپ کا امریکہ کا سفر ہوا، وہاں بھی اسی نوع کے روشن خیال طبقہ سے آپ کا خطاب ہوا اس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"چوتھی بات یہ کہ آپ امریکہ میں ہیں آپ کو علمی ذوق اور مطالعہ کا شوق بھی ہے، اسلامی لٹریچر پڑھتے ہیں۔ایک بات میں اپنے تجربے کی بنا

پر کہتا ہوں کہ آپ سلف صالحین اور امت کے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دینی وملی کام کیا ہے، بدگمان نہ ہوں، یہ بڑے خطرہ کی بات ہے، یہ بات ہمارے ان بھائیوں میں بہت زیادہ پیدا ہوتی جاری ہے جن کا سارا انحصار مطالعہ پر ہے، وہ تنقیدی کتابیں اور مضامین پڑھتے ہیں تو ان کو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ کسی نے اسلام پر مکمل کام ہی نہیں کیا، ان کتابوں کے اثر سے وہ دینی خدمت کے ناپنے کے لئے فیتہ بنا لیتے ہیں جس سے وہ ہر مصلح اور مجدد کو ناپتے ہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ کے بندوں نے کن سخت حالات میں کام کیا، بعض مرتبہ کسی وجہ سے یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ایک ہی کام ہے، اگر کسی نے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تو گویا اس نے کوئی کام ہی نہیں کیا، چاہیں وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ہوں یا حضرت مجدد الف ثانیؒ، میں صاف کہتا ہوں کہ اسلام اب جو دنیا میں محفوظ ہے اور زندہ ہے اس میں سب کا حصہ ہے، محدثین، فقہا، صلحاء امت، اولیاء اللہ رحمہم اللہ سب کا اس میں حصہ ہے۔" (خطبات علی میاں: ص، ۱۴۳ و ۱۴۴، ج ۳)

یہ گفتگو آپ نے خاطبین کے حالات ومزاج کے مطابق فرمائی تھی۔

متفرق خصوصیات اور بعض اہم پیغامات

اس کے علاوہ مولاناؒ کے خطبات کی متفرق خصوصیات ہیں جن کو تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے، مثلاً یہ کہ اپنے مخاطبین وسامعین کے سامنے اپنے آپ کو اس انداز سے پیش فرماتے تھے، اور خطبہ کے آغاز ہی میں ایسے کلمات ارشاد فرماتے تھے جس سے مخاطبین

وسامعین کو حضرت مولاناؒ کے مخلص کامل ہونے کا یقین ہو جائے مثلاً جس موقع پر آپ تقریر فرماتے وہاں کی خصوصیات کا ذکر فرماتے، مخاطبین اور وہاں کے افراد کے تعلق سے دور کی کوئی نسبت اور روحانی رشتہ نکل سکتا ہوتا تو آپ اس کو بیان فرماتے، مثلاً یہ فرماتے کہ یہ وہ تاریخی جگہ ہے، یہاں سے ہم کو قریبی تعلق ہے، یہ جگہ ہمارے لئے نئی نہیں ہے، یہاں کی زمین سے ہم کو انس ہے، اس سلسلے میں بسا اوقات کچھ واقعات بھی بیان فرمادیتے، اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ مخاطبین وسامعین کو اس بات کا کامل یقین ہو جائے کہ کہنے والا جو بات کہہ رہا ہے نہایت دلسوزی اور خیرخواہی سے کہہ رہا ہے، اس میں اس کی اپنی ذاتی کوئی غرض نہیں ہے، اور یہ اسلوب وانداز وہی ہے جس کو تمام انبیاء ورسل نے بھی اختیار فرمایا ہے وہ بھی اپنے مخاطبین کو اپنا ناصح اور خیرخواہ ہونے کا یقین دلاتے تھے چنانچہ کھلے الفاظ میں فرماتے تھے، " انا لکم ناصح امین "حضرت مولاناؒ کے خطبات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انداز تفہیم وتبلیغ میں بجائے منفی انداز کے ہمیشہ مثبت انداز اختیار فرماتے تھے، اور عام طور پر تنقیدی انداز سے اور طعن وتشنیع سے کلی پرہیز فرماتے تھے، منکرات پر نکیر میں بھی وہ انداز اختیار فرماتے تھے جس میں منکرات کی تلخی کے ساتھ معروفات کی شیریں شامل ہوتی اور اس گھونٹ کو پینا آسان اور خوشگوار معلوم ہونے لگتا، موقع پڑنے پر آپ کلمة حق عند سلطان جائر ' سے بھی نہ چوکتے تھے، اخیر عمر میں آپ کے خطبات میں دعوت توحید وسنت کا رنگ غالب ہوگیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ آپ کے خطبات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں امت کے ہر طبقہ کے لئے اہم ہدایات اور ضروری پیغامات ہیں خصوصاً نئی نسل، نوجوان طبقہ اور کالجوں، یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے، امت کے ہر طبقہ کے تعلق سے جو مولاناؒ کی ہدایات ونصائح اور اہم پیغامات ہیں اگر ان سب کو علحدہ علحدہ

مرتب کیا جائے تو کام کرنے والوں کو بڑی بصیرت ورہنمائی ملے، اور کام کرنے کا ایک میدان سامنے آجائے۔

یہ چند خصوصیات مولاناؒ کے خطبات کی ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو مولانا کے خطبات سے منتفع ہونے اور قدر دانی کی توفیق عطاء فرمائے۔

☆☆☆

دل چیر کے ذرّوں کا بڑائی مانگے
تاروں کی بزم میں رسائی مانگے
دھرتی ہو کہ آکاش رہے قبضے میں
اس عہد کا انسان خدائی مانگے

☆

خورشید ہوا نور فشاں تیرے لئے
یعنی قمر و کاہکشاں تیرے لئے
تو کس کے لئے ہے یہ تجھے یاد نہیں
تخلیق ہوئے سارے جہاں تیرے لئے

رئیس الشاکری ندوی

ڈاکٹر کلیم الرحمٰن ندوی، بھوپال

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ملک وقوم کی فکر
(خطبات کی روشنی میں)

مولانا ندویؒ کی ہمہ گیر شخصیت موجودہ دور کے علماء، قائدین، ارباب سیاست اور دانشوروں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولاناؒ تصنیف وتالیف، تعلیم وتدریس کے علاوہ خطابت کے جوہر سے بھی مکمل آراستہ تھے۔ موضوع، موقع محل حالات کا تقاضا اور حاضرین کے مطابق بیان فرماتے تھے۔ مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر جس طرح ان کی زبان سے قیمتی کلمات صادر ہوتے تھے، اسی طرح ملی و ملکی موضوعات پر ان کی آواز ہمیشہ بلند رہتی تھی۔ وہ ملک کی سلامتی، یہاں کی اقوام میں محبت وہمدردی کا قیام اور ہندوستانی مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے سلسلے میں ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ ندوۃ العلماء سے فکری وابستگی کے باوجود ان مقاصد کے لیے انہوں نے مسلم مجلس مشاورت اور پیام انسانیت جیسی تنظیموں کی بنیاد ڈالی اور اپنی توانائیاں ان میں لگادیں۔ ان تنظیموں سے مولاناؒ نے ملک میں اخلاقی قیادت سے لوگوں کو آشنا کرایا اور یہ ثابت کردیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کو پیش نظر رکھے بغیر کسی سیاسی پروگرام کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ ملک وقوم کے لئے ان کے دل میں جو جذبات واحساسات تھے ان کا اعتراف تمام قائدین ملک نے کیا، وزیراعظم

اندرا گاندھی سے لے کر اٹل بہاری باجپئی تک مختلف سیاسی فکر و نظر کے حامل زعماء نے مولاناؒ کی شخصیت کو تسلیم کیا، اور بالواسطہ یا بلاواسطہ اہم ترین مسائل میں مولانا کے مشوروں کو اہمیت دی۔ تمام دینی و مذہبی و دعوتی ذمہ داریوں کا حق جس طرح مولانا مرحومؒ نے اپنی زندگی میں فرمایا، اسی طرح ایک سچے محب وطن ہندوستانی رہنما کا کردار بھی آپ نے خوب ادا کیا، مولاناؒ کو ہندوستان میں سب سے زیادہ فکر امن و امان کی رہتی تھی۔ اور اس سلسلہ میں آپ نے اپنی زبان و قلم کا بھرپور استعمال کیا اور علَم بردارانِ سیاست اور زعماء حکومت کو وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، آپ کو اپنے وطن ہندوستان اور اس کی نسبت و تعلق اور اس کے طول و عرض پر ناز تھا، نازک سے نازک حالات میں بھی انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اس سے باز رکھا، اور پاکستان جانے والوں کو کبھی پسند نہیں کیا، بعض مرتبہ اپنی تقریر و تحریر سے اس طرف اشارہ بھی کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں، ان لوگوں کی طرح نہیں جن کو ہواؤں اور طوفانوں نے اڑا کر ادھر سے ادھر کیا اور وہ کہیں بھی جا گرے اور حالات کے رحم و کرم پر گرے پڑے رہے، ان کو ہندوستان، اس کی جغرافیائی حیثیت اور ہیئت سے، اس کی ترقی سے بے پناہ محبت تھی۔ مولاناؒ چاہتے تھے کہ ہندوستان امن، شانتی اور بھائی چارہ میں دنیا کی قیادت کرے، اور ایشیا کا امام بن جائے۔ وہ ملک اور اہل ملک کی جان و مال، عزت و آبرو، امن و سکون اور مختلف فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں میں اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی اور معاونت کے خواہاں تھے۔ سربراہان مملکت، وزراء اور امراء کو مختلف طریقوں سے متوجہ کرتے رہے اور وطن سے حقیقی محبت کا سبق پڑھاتے رہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے مخلصانہ جد و جہد اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے برابر اکساتے رہے۔ اس ملک کو خیر سگالی،

انسانیت دوستی، بھائی چارہ اور اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کراتے رہے۔ بغیر کسی غرض اور خواہش، بغیر کسی کی حمایت اور مخالفت کے مختلف فرقوں اور سیاسی طبقات کے رہنماؤں اور ذمہ داروں کو پیامِ انسانیت کے اسٹیج اور مختلف دعوتوں کے ذریعہ قریہ قریہ اور شہر شہر میں احساس دلاتے رہے، ایک جگہ حضرت مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

''ہندوستان جو مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، مذاہب وادیان وفلسفہ وفکر کا مرزبوم ہے، جہاں مفکرین، سیاست دانوں، مدبروں کی کوئی کمی نہیں، لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج ان لاتعداد دانشوروں، ادیبوں، حکیموں، قائدوں اور اجتماعی کارکنوں میں کوئی بھی انسانی اخلاق کی تعمیر کے لئے اس مہم کو لے کر آگے بڑھنے والا نہیں، کسی کو یہ فکر نہیں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اس سے بڑھ کر بھی بگاڑ کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ آج زندگی بچانے والی دوائیں نقلی آنے لگی ہیں، ایک وزیر صحت کی زبانی سنا کہ ساٹھ فیصد دوائیں نقلی ہوتی ہیں، اسی طرح اقرباء پروری، رشوت خوری، لوٹ، کھسوٹ، لاپرواہی، غبن، حقوق کی پامالی اور اس جیسی معاشرتی بیماریاں جو آج پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس سے شفاخانے اور صحت کے مراکز (Sanitoriusm) تعلیمی وانسانی ادارے بھی محفوظ نہیں، اس صورت حال میں ملک کی گاڑی کیسے چلے گی، اور زندگی کیسے گذرے گی۔''

(کاروان زندگی حصہ چہارم ص:۶۰)

ہندوستان کی تمام قوموں خاص طور پر مسلم اقلیت کے تحفظ کے لئے مسلم مجلس مشاورت کے قیام کے بعد گجرات میں ایک عظیم الشان جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اور

اپنے ملک اور اس کے وسیع و عریض رقبہ کا ذکر کرتے ہوئے مولاناؒ نے فرمایا:

''خدا نے ہم کو کتنا بڑا ملک دیا ہے، دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالئے، کتنے چھوٹے چھوٹے ملک اس کے اندر نظر آئیں گے، اللہ نے ہم کو ایسا ملک دیا ہے کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں ریل گاڑیاں چلتی رہتی ہیں، اور سرحد نہیں آنے پاتی، خدا کی مہربانی سے ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں، ہم نے اس ملک کو بنانے اور سنوارنے میں ابھی تک اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ کرنی چاہئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس کو اس طرح اپنی زمین اور اپنی چیز نہیں سمجھتے، جیسے ایک کسان اپنی زمین اور اپنے گھر کو سمجھتا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات اور موجودہ خرابیوں کی جڑ اتنی اتھلی اور سطحی نہیں ہے جتنی سمجھی جاتی ہے، ان کی خرابیوں کی اصل جڑ اپنے گروہ، اپنی پارٹی اور اپنے بھائی کی جا و بیجا حمایت اور اس کی پاسداری کرنے کا جذبہ اور ہر غلط و صحیح کام میں اس کا ساتھ دینے اور اس کو جتانے کا اصول ہے۔''

اسی خطاب میں مذہب کی حمایت کرتے ہوئے گندی سیاست سے حاضرین کو آگاہ کیا:

''اپنے اعمال و کردار سے مذہب کو مفت بدنام کیا جاتا ہے، مذہب کا کیا قصور؟ کیچڑ میں لت پت کتا جس کی گود میں بیٹھ جائے گا اس کو ناپاک کردیگا۔ نیک پاک صاف شخص کی گود میں بیٹھ جائے گا تو اس کو بھی ناپاک کردے گا۔''

(تعمیر حیات، ۱۰ر جنوری ۱۹۶۵ء)

ملک میں عوام و خواص کے اضطراب، آفسوں اور محکموں میں کاموں کا نہ ہونا، ہر جگہ خود غرضی اور رشوت خوری اور نفس پرستی کی گرم بازاری پر مولانا اکثر بے چین رہتے تھے۔

پبلک جلسوں میں مولانا کی یہ بے چینی نمایاں ہوتی تھی، اور وہ اپنے دل کا درد بتائے بغیر نہیں رہتے تھے۔ مولانا کو معلوم تھا کہ قائدین اور سیاستداں چاہے کتنا ہی اعلان کریں لیکن ترقی جب تک عوام تک نہ پہنچے اور ان کو دووقت کی روٹی نہ ملے وہ ترقی نہیں ہو سکتی۔

حلقہ پیام انسانیت کا قیام ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان ملاپ اور اتحاد واتفاق کے لئے ہوا تھا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر تھا کہ عوام کے دکھ دور ہوں، اور وہ اپنی حکومتوں کے زیر سایہ امن وامان سے رہیں۔ اسی سلسلے کے ایک جلسۂ عام منعقدہ گورکھپور، فروری ۱۹۸۴ء میں مولانا نے بڑی دردمندی سے فرمایا:

"میں تعجب کرتا ہوں کہ یہ سارے کام ہوتے رہتے ہیں ہمارے اس ملک میں لیکن دم کیوں نہیں گھٹتا ہے لوگوں کا۔ سب اپنی پارٹیاں بنا رہے ہیں، اخباروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی ہی ترقی ہے، اور شانتی ہی شانتی ہے اور امن ہی امن ہے، ملک بہت ترقی کر رہا ہے۔ لیکن اندر کیا ہو رہا ہے یہ آپ ریل سے سفر کرنے والوں سے پوچھئے، ریلوں پر سفر کرنا مشکل، ہوائی جہاز پر سفر کرنا مشکل، دفتروں میں کام کرنا مشکل، جب کہ ہمارا حق ہے کہ ابھی کام ہونا چاہئے، لیکن مہینوں میں نہیں ہوتا۔"

مولانا ویسے تو تمام بندگان خدا کو اللہ کا کنبہ ہی سمجھتے تھے اور ہر ہندوستانی پر یہ لازمی قرار دیتے تھے کہ اپنے ملک کے لئے فکرمند ہوں، اور اس کی صورت وکردار بگاڑنے والا کوئی کام نہ کرے، لیکن چونکہ وہ ایک مردمومن تھے، دنیا کی صلاح وفلاح کا ذمہ دار اہل ایمان کو سمجھتے تھے، اس ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اور ان کو بڑی امیدیں مسلمانوں سے وابستہ تھیں کہ وہ اس

ملک کو جنت نشان بنا سکتے ہیں۔اس لئے کہ وہ ایمان وخوف خدااور فکر آخرت سے وابستہ ہیں۔لکھنؤ کے ممتاز ہائر سکنڈری اسکول میں ۱۷رمئی ۱۹۶۸ء دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ تھا جس میں عمائدین شہر، علماء دین، اور سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد تھی، مولاناؒ نے اس موقع پر صاف طور پر اعلان فرمایا کہ:

"کسی فرقہ میں اتنی دیانت داری، اور امانت داری نہیں ہے جتنی مسلمانوں میں ہے۔اور اس گئی گذری حالت میں بھی کسی فرقہ میں اتنا خدا کا خوف نہیں ہے جتنا مسلمانوں کے اندر ہے۔میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور دہلی کے ایوانوں میں جا کر کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر آج اس ملک کی کنجیاں مسلمانوں کے حوالے کی جائیں اور کلیدی عہدوں پر مسلمانوں کو رکھا جائے، آج مسلمانوں کو فوج کے بڑے بڑے عہدے دئے جائیں، ملک کی حفاظت سیکورٹی کے لئے مسلمانوں کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے تو آج یہ ملک چارگنا زیادہ منور ہوسکتا ہے۔"

(تعمیر حیات، جولائی ۱۹۶۸ء)

مولانا ہندوستان کے شاندار ماضی، یہاں کی پر امن فضا اور ماحول اور مختلف قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو اکثر یاد کرتے تھے۔اور بڑے بڑے جلسوں میں اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ان کو اس کی بھی شدید فکر تھی کہ ملک میں سائنسی ترقی، اسلحہ کی جدت اور مشینوں کی یافت اپنی جگہ ہے۔لیکن اس ملک کا اصل سرمایا اور دولت اس کی نسل اور مستقبل کے باشندے ہیں۔آج ان کا ذہن ومزاج کس طرح تعمیر ہو رہا ہے اور ان کے اندر شدت اور ہنسا کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ جو اچھی علامتیں نہیں

ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کے معماروں کو صبر وضبط کا پیکر ہونا چاہئے اور ان کے اندر سنجیدگی پیدا ہونا چاہئے۔ سیفیہ کالج بھوپال میں نمائندہ اصحاب فکر ونظر اور اساتذہ وطلبہ کو ۵/ستمبر ۱۹۸۵ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے نزدیک کسی ملک کا اقتصادی، فوجی اور تمدنی استحکام سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ اس کی نئی نسل خصوصاً طلبہ کس ذہن ومزاج کے حامل بن کر تیار ہو رہے ہیں۔ یا انہیں نظم ونسق کے ساتھ اپنی خواہش کے خلاف کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔

ضبط نفس کا فقدان ایک المیہ ہے۔ آج ذاتی، خاندانی، گروہی اور جماعتی مفادات کا اس شدت سے مظاہرہ ہو رہا ہے کہ اس میں ملک کے عوام کے ساتھ ساتھ دانشور اور قائد تک گرفتار ہو چکے ہیں۔"

(ایاز بھوپال، ستمبر ۱۹۸۵ء)

مولاناؒ کو ہندوستان کے باشندوں میں اخلاقی کردار کی گراوٹ اور پُرامن بقائے باہمی کے فقدان پر بڑا ملال رہتا تھا۔ اور وہ اس کا صاف طور پر پارلیمانی سیاست کو ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ جس کے نتیجے میں رہنماؤں سے لے کر عوام تک سب کے سب حرص وہوس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ صدر منزل بھوپال میں ۶/ستمبر ۱۹۸۵ء کو جلسہ عام میں آپ نے ملکی سیاست پر ان الفاظ میں تنقید فرمائی:

"ملک میں روز افزوں تشدد، بدامنی اور اخلاقی زوال کا سبب پارلیمانی سیاست ہے، آج اس سیاست کے نتیجہ میں عوام کو انسان کی نظر سے نہیں محض ایک ووٹر کی حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ اخلاقی اقدار، سیکولرازم اور قومی اتحاد ملک کی بقاء کے لئے ناگزیر ہے۔"

(روزنامہ آفتاب جدید، ۸/ستمبر ۱۹۸۵ء)

ہندوستان کے بارے میں اپنے صحیح عقیدہ وشریعت کے پیش نظر مولانا کا جونظریہ تھا وہ تمام تر قائدین اور اہل سیاست سے جدا تھا۔ اس نظریہ کو جب بھی دین وسیاست کے جلسوں اور کانفرنسوں میں پیش کیا گیا اس کو سراہا گیا۔ اور قبول کیا گیا۔ خاص طور پر ہندوستانی علماء کے لئے مولانا کا یہ انداز مہمیز کے طور پر کام کر گیا۔ یہ علماء خود کو درس وتدریس، دعوت وتبلیغ اور رشدوہدایت کے مرکزوں کی سرگرمیوں سے نکال کر حسب ضرورت ملک وملت کے لئے کام کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور ایک مذہبی فریضہ کی طرح اس خدمت کو انجام دینے لگے۔

☆☆☆

آئینہ جاں دیر و حرم اُس کے لئے
رکھئے سرِتسلیم کو خم اُس کے لئے
ہم اَحسنِ تقویم خبردار رئیسؔ!
سب کچھ ہے ہمارے لئے ہم اُس کے لئے

رئیس الشاکری ندوی

محمد معز الدین فاروقی ندوی

''ایمان کی قدر و قیمت اور اہمیت''

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی ایک تقریر

مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کی ایک کانفرنس منعقدہ ۱۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء میں فرمایا تھا:

> ''اگر میں آپ سے کوئی معاہد کرتا تو یہ کرتا کہ آپ اس احساس وشعور کو زندہ رکھیں کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے، اس کے لئے میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتا ہوں اور جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی۔''

انداز بیان قابل غور ہے، خاص طور پر یہ جملہ کہ ''مجھے حیرت ہوتی ہے اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی'' کس قدر زور ہے اس جملہ میں۔ ''میں ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتا ہوں'' بھی کہا جا سکتا تھا لیکن اس میں بے پناہ حیرت کی تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں۔

> ''لیکن مجھے اندیشہ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے صحیح نتیجہ نکالا ہے، اسلاف کرام اور مقررین عظام کا ذہن بے شک ان چیزوں کی طرف گیا ہوگا جہاں ہمارا ذہن جا نہیں سکتا، لیکن آج کے

پڑھنے والے بہت کم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، قرآن مجید کی سورہ کہف کے اخیر میں یہ قصہ بیان کیا گیا کہ حضرت خضر نے ایک لڑکے کی جان لے لی اور وہ بھی ایک اولوالعزم اور عظیم الشان پیغمبر حضرت موسیٰ کی موجودگی اور رفاقت میں، حضرت موسیٰ نے حضرت خضرؑ سے پوچھا کہ آپ نے بچہ کے ساتھ یہ کیا معاملہ کیا؟ اس کا کیا جرم تھا؟ اور کیا وہ جرم ایسا تھا کہ اس کی جان لے لی جائے؟ حضرت خضرؑ نے کہا کہ اس کے ماں باپ دونوں صاحب ایمان اور نیک تھے اور یہ بچہ فتنہ بننے والا تھا، اگر یہ زندہ رہ جاتا تو اپنے ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنتا، تو میں نے اس لئے ان کو اس خطرہ سے بچالیا اور اس کی جان لے لی کہ اللہ تعالیٰ اور اولاد دے گا۔"

یہاں تک تو نفس واقعہ ہے اب مولانا اپنی قوت استدلال سے ثابت کرتے ہیں کہ اس کی پیچھے کیا نکتہ ہے۔

"آج پوری دنیائے اسلام، بڑی سی بڑی آزاد حکومت اور شرعی حکومت بھی اس پر عمل نہیں کرسکتی، آپ سب جانتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا بالکل حرام اور ناجائز ہے کہ محض اسی خطرہ سے کہ یہ بچہ کبھی فتنہ بن جائے گا اور بہت سے بچے فتنہ بن رہے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کی جان لینے کی اجازت نہیں اور جان لینا تو جان لینا ہے اور کوئی بہت بڑی سزا معصومیت میں نہیں دی جاسکتی تو پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس واقعہ کو سورہ کہف میں داخل کرکے اسے زندہ جاوید کیوں بنادیا؟"

یہاں تک پہنچ کر ہماری سانس رک جاتی ہے، کہ اب مولانا کیا نکتہ پیش فرمانے والے ہیں اور کون سا نیا گوشہ جواب تک تاریکی میں تھا روشن کرنے والے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

> ''اس کی حکمت یہی ہے کہ ہم آپ سوچیں کہ ایمان وہ قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے حضرت خضرؑ نے جو بڑے فقیہ، بڑے عارف باللہ اور بڑے صاحب بصیرت اور مقبول عنداللہ تھے انہوں نے یہ کام کیا کہ اس بچہ کی جان لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سنایا اور قرآن مجید میں یہ قصہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا تا کہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ ایمان اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لئے جو چیز خطرہ بننے والی ہے اس خطرہ کو بھی دور کرنا چاہیئے، چاہے وہ کیسے ہی پیاری اور عزیز کیوں نہ ہو، مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔''

مولاناؒ ایک نہایت باریک اور دقیق نکتہ بیان کرتے ہیں لیکن قربان جایئے کہ زبان و بیان سہل پر کہ شاعری کی اصطلاح میں اس کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ یعنی جو بظاہر نہایت آسان اور سہل نظر آتا ہو لیکن لاکھ کوشش پر بھی کوئی اس طرح نہ کہہ سکے اور اس کی نقل نہ کر سکے اب اسی سورہ کی دوسرے قصہ اور واقعہ کا حال مولاناؒ کی زبان معجز بیان سے سنئے:

> ''قرآن کریم کا ایک اعجاز اور الہامی نکتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں بیان فرمایا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ ایک بستی میں گئے اور وہاں انہوں نے دیکھا کہ دیوار مسمار ہونے والی ہے اس موقع پر وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم پردیسی ہیں اور ہماری ضیافت ہونی چاہیئے اور زبان قال سے بھی، جیسا قرآن مجید سے اشارہ معلوم ہوتا ہے لیکن پوری بستی میں کسی نے خبر نہیں لی اور کھانا پیش نہیں کیا اور وہ

بھوکے رہے مگر دیوار جو گر رہی تھی حضرت خضرؑ اس کو سنبھالنے لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، حیرت کی بات ہے کہ کہاں سے وہ مسالہ لائے اور انہوں نے کتنی محنت کی ہوگی، حضرت موسیٰؑ نے کہا عجب تضاد ہے کہ جنہوں نے کھانے تک کی خبر نہیں لی ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا ان کا کہاں سے یہ حق تھا اور کیسا احسان تھا کہ آپ نے اس دیوار کو جس کی مرمت میں وہ مزدور لگاتے پیسے خرچ کرتے اور خود توجہ کرتے آپ نے اس دیوار کو سنبھال دیا تو انہوں نے کہا:

"یہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا باپ نیک تھا یہ دیوار گر جاتی تو جو خزانہ اندر دبا ہوا تھا وہ کھل جاتا، سامنے آجاتا اور لوگ لوٹ لے جاتے اور ان کو غربت کا سامنا کرنا پڑتا اور ان کے پاس کچھ نہ رہتا۔"

مولانا ایمان کو مرکزی نکتہ مان کر ان دونوں واقعات سے کیسے بلیغ نتیجہ پر پہنچتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

"ایک طرف جان لی ایمان کے خطرہ سے اور ایک طرف دیوار سنبھالی ایمان کی فضیلت کے حصہ سے جب کہ وہ خود بھی نہیں بلکہ ان کے ماں باپ نیک تھے معلوم نہیں ان کے انتقال کو کتنا زمانہ ہوگیا تھا۔"

ایمان کی قیمت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں واقعے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورۃ میں نیچے اوپر بیان کئے تاکہ آپ کو ایمان اور کفر کا فرق معلوم ہو۔ ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جن کے ماں باپ نیک تھے ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا ابھی سن بلوغ کو نہیں پہونچے تھے اور وہ دو یتیم بچے تھے ان کے ماں باپ

چونکہ صاحب ایمان اور نیک تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کی قدردانی میں دیوار سنبھالنے کا انتظام فرمایا اور حضرت خضرؑ نے وہ دیوار سنبھالی۔

آگے چل کے مولانا محترم دیوار کے استعارے کو اور پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اب یہ حکم نہیں کہ جس کو آدمی قابل خطرہ سمجھے اور اس کو اس طرح قتل کردے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اگر خطرہ سمجھے تو اس کو اسی دیوار کی طرح سنبھالے جو گر رہی تھی، ویسے ہی اپنی اولاد کو اور اپنی آنے والی نسل کو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کردے، اس کو مضبوط بنائے، مستحکم کرے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے عقیدے نے اس کو قبول کرلیا کہ ایمان جان سے بھی زیادہ عزیز ہے تو پھر علاج ومعالجہ، اور کپڑے بنانے سے، انہیں دعائیں دینے، اور انہیں دیکھ کر خوش ہونے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے ایمان کا تحفظ کرے، آخری بات میری طرف سے یاد رکھئے کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ " یایھاالذین آمنوا قوا أنفسکم وأھلیکم نارا" اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

دوزخ کی آگ سے کس طرح بچا سکو گے؟ ایمان کے ذریعے سے بچا سکو گے۔

(تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰/اگست ۱۹۹۸ء)

ہم آگ سے ڈرنے کی بات کا ذکر جابجا مولاناؒ کی تقریروں میں دیکھتے ہیں، چنانچہ ایک تقریر جو مولاناؒ نے ۱۸/اکتوبر ۱۹۹۱ء میں مدرسہ الفلاح (اندور) کی ایک مسجد میں جمعہ کے دن فرمائی تھی جس کا عنوان رسالہ تعمیر حیات لکھنؤ نے یہ لگایا ہے کہ "آگ سے ڈرتے ہیں لیکن آگ میں لے جانے والے اسباب سے نہیں ڈرتے!" آپ نے یہ تقریر آیت کریمہ "یایھاالذین آمنو قوا انفسکم و اھلیکم نارا

وقودھا الناس والحجارۃ" ترجمہ: مومنو! اپنے آپ کو اپنے اہل وعیال کو آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں کو سامنے رکھ کر فرمائی۔"

اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا علی میاں ندویؒ نے فرمایا:

"لوگ نتائج سے تو ڈرتے ہیں لیکن نتائج پیدا کرنے والے اسباب سے نہیں ڈرتے یعنی آگ سے تو ڈرتے ہیں لیکن آگ میں لے جانے والے اسباب سے نہیں ڈرتے۔ اس کھلی ہوئی حقیقت اور روز روشن کی طرح عیاں غلطی میں بڑے بڑے فلاسفہ، علماء اور حکماء سب مبتلاء ہیں، کوئی اپنی اولاد کو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن نادانی اور غفلت سے اسباب وہی اپناتا ہے جو آگ میں لے جانے والے ہیں۔"

ایک مثال سے مولانا محترم نے اس دل نشیں بات کو نہایت دلنشین پیرائے میں سمجھایا، فرماتے ہیں:

"ایک خاتون شادی میں شرکت کے لئے گئیں، وہاں ہر ایک خوش وخرم نظر آتا ہے۔ اپنی خوشی اور بشاشت کا اظہار کرتا ہے مگر ان خاتون کے چہرے پر اداسی بلکہ گھبراہٹ سی طاری تھی، عورتوں نے پوچھا: بہن! کیا بات ہے؟ آپ نہیں بول رہی ہیں، کیوں خاموش خاموش چپ سادھے بیٹھی ہیں؟ اس خاتون نے جواب دیا: بہن! میں جب گھر سے نکلی تو میرا بچہ سو رہا تھا، میں اسے سوتا چھوڑ کر چلی آئی، فکر لگی ہوئی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جاگے اور وہیں طاق پر ماچس رکھی ہوئی ہے لے کر کھیلنے لگے، جلائے اور اس کے کپڑوں میں آگ لگ جائے، عورتوں نے بہت سمجھایا اور مطمئن کرنا چاہا کہ بہن آپ اطمینان رکھیں، بچہ جاگے گا تو طاق پر رکھی

ہوئی ماچس جو اوپر ہے کیونکر لے گا؟ کیسے اس پر چڑھے گا؟ آپ خواہ مخواہ وہم سے پریشان ہیں۔غرض! اس کو بہت کچھ اطمینان دلایا لیکن اس دور از قیاس امکان پر بھی اس کے دل میں جو کھٹک پیدا ہوگئی تھی وہ دور نہ ہوسکی۔اس لئے کہ ماچس کی تیلی جلانے کا نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔"

مولانا محترم اس واقعے سے جو نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں وہ جہنم کی آگ میں جلنے کا خوف ہے جس کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔فرماتے ہیں کہ مگر ہمارا بچہ جب ایسے طور طریقے اپناتا ہے جو اسے اسلام اور شعائر اسلام سے دور لے جاتی ہیں، مشرکانہ عقائد کی طرف لے جاتی ہیں، خدا فراموشی کی راہ پر ڈالتی ہیں جو سراسر جہنم میں لے جانے والی باتیں ہیں، تو اس ماں کو ذرا بھی فکر و تشویش نہیں ہوتی۔آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ آگ سے بچانے کے لئے دینی عقائد کی حفاظت ضروری ہے۔یہ ایمان و یقین کہ اس پوری کائنات کا خالق و مالک تنہا ایک خدا کی ذات ہے۔اور پورے نظام کو وہی چلاتا ہے، اس کے چلانے میں اس کو کسی کی مدد، نہ سہارے کی ضرورت ہے اور نہ وہ انسانوں کی طرح کبھی تھکتا اور اکتاتا ہے اور نہ اس پر نیند و غفلت طاری ہوتی ہے۔ "لاتأخذہ سنة ولانوم" مولانا کی زبان شستہ و کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی اور انداز بیان دل نشین اور دل پذیر ہے۔کاش مجھے اتنی قوت و استعداد حاصل ہوتی کہ میں اپنے چھوٹے سے مضمون میں مولانا کے انداز خطابت کا کامل احاطہ کرسکتا ہے۔

☆☆☆

محمد ایوب صدیقی ندوی

پاجا سراغ زندگی-ایک مطالعہ

فکری ابلاغ وترسیل کی دو مضبوط بنیادیں ہیں: زبان اور قلم ۔زبان وقلم کی حیثیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔انسانی زندگی کی صلاح وفلاح میں ان دونوں عوامل کا جو بنیادی اور اساسی رول ہوتا ہے،اس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔

تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ تنہا ایک شخص نے اپنی زبان وبیان کی قوت اور زور خطابت کی بنیاد پر پوری قوم کے فکر ونظر میں انقلاب برپا کردیا۔خود ہندوستانی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ تنہا ایک شخص نے اپنے زور خطابت اور قوت بیان سے پوری قوم کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کردیا۔زبان کی سلاست اور قوت بیان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے آیت قرآنی "ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین "اور رسول اکرم کا ارشاد گرامی " ان من البیان لسحرا "کو سامنے رکھنا کافی ہے۔

ہندوستان جو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔جہاں بھانت بھانت کے لوگ اپنے مذہبی عقائد اور تہذیبی شناخت کے ساتھ رہتے ہیں۔ایسے ملک میں ایک داعی اسلام کی ذمہ داری مزید دوچند ہوجاتی ہے۔زور بیان اور قوت استدلال کی اہمیت زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔اصلاح امت کا کام ان کو وراثت میں ملا تھا۔وہ خالص النسب سید زادہ اور حضرت سید احمد شہیدؒ

کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں اصلاح امت اور دین مبین کی جو خدمت انجام دی ہے وہ اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ پھر دار العلوم ندوۃ العلماء سے ذمہ دارانہ ربط و تعلق نے اس ذمہ داری کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ حضرت مولانا نے اپنی نوعیت کی منفرد تحریک ''پیام انسانیت'' کی بنیاد رکھی اور اس کے پلیٹ فارم سے پورے ہندوستان میں پھر کر انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ امن و آشتی، صلح وصفائی اور بقائے باہم کا درس دیا۔ ان کی تقریروں اور خطبات کا بڑا ذخیرہ ہے جس پر ایک چھوٹی سی تحریر میں گفتگو کرنا ناممکن ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف وہ خطبات ہیں جسے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے ''پا جا سراغ زندگی'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں جملہ گیارہ تقریریں ہیں جو حضرت مولانا نے عام طور پر طلبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے مختلف مناسبت سے فرمائی ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ دو تقریریں بھی شامل ہیں جو حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے کی ہیں۔ نیز ایک خطاب جامعہ رحمانی مونگیر اور ایک جامعہ ہدایت جے پور کا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فرزند اور اس کے وسیع تخیل کے امین و پاسبان تھے۔ مدارس اسلامیہ ہندیہ سے ان کا سب سے گہرا ربط اور تعلق تھا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ طلبائے مدراس اسلامیہ کو خطاب کرتے تھے تو دردوسوز اور احساسات و جذبات کا سمندر ان کے فکر و قلب میں موجزن ہوتا تھا اور وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اپنا سارا علمی اثاثہ، وسیع مطالعہ کا نچوڑ اور زندگی کے تجربات کو بے تکلف طلبہ کے سامنے رکھ دیں، کوئی بھی شخص جب ان کی ان تقریروں کو سنے گا یا پڑھے گا تو اسے اندازہ ہوگا کہ قلب وفکر کی سطح پر ایک تلاطم برپا ہے، اور مولانا اپنا پورا اندوختہ مخلصانہ طور پر بے تکلف نکال کر سامنے رکھ دینا چاہتے ہیں۔

عالم اسلام کو بیسویں صدی میں جس زوال وانتشار سے دوچار ہونا پڑا اس پس منظر میں علماء اسلام کی ذمہ داری کے احساس نے انہیں بے چین کردیا تھا، ان تقریروں کے پڑھنے کے بعد ان کی دردمندی، جگر سوزی اور احساس ذمہ داری کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

مدرسہ کی اور مدرسہ کے طالب علم کی ذمہ داری، موجودہ دور میں ان کا کردار، دنیا کے نقشہ میں اس کی حیثیت، انسانیت کے لئے اس کی مسیحائی اور جاں نوازی اور اس کے عظیم علمی ودعوتی مقاصد اور فوائد کی اہمیت کا ان سے بڑھ کر کس کو اندازہ ہوسکتا تھا، مولانا کے الفاظ میں مدرسہ کا تعارف دیکھئے جو مدرسہ کا سب سے شاندار اور جاندار تعارف بلکہ شاید سب سے بڑا اخراج ہے۔

> ''میں مدرسہ کو ہر ادارہ سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے دوسرا اس زندگی سے، وہ نبوت محمدی کے چشمہ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے۔ وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں، اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدی کا دریا پایاب ہونے والا ہے نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمہ فیض سے بخل اور انکار ہے نہ انسانیت کی کاسہ گدائی کی طرف سے استغنا کا اظہار، ادھر سے "انما أنا قاسم والله يعطي" کی صدائے مکرر ہے تو ادھر سے "هل من مزيد" کی فغان مسلسل۔

مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سازندہ متحرک اور معروف ادارہ ہوسکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بیشمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار،

زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں، دنیا میں ہر ادارہ ہر مرکز ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے۔"

مغربیت ولادینیت کے عالم گیر سیلاب میں عربی مدارس کی ذمہ داری بالعموم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں کی بالخصوص آج پہلے سے بہت زیادہ ہے، ندوہ کی کچھ اس لئے زیادہ ہے کہ علوم دینیہ اور علوم عصریہ کی جامعیت، جدید اسلحہ سے لیس ہونے اور علمی وادبی میدان میں اپنے حریفوں سے فائق و برتر ہونے کی دعوت ابتدا سے اس کی بنیاد میں شامل بلکہ اس کے تخیل اور نصب العین کی اساس ہے، مدرسہ کے تعارف میں ایک دوسرا اقتباس ان کی تقریر سے ملاحظہ فرمائیے:

"مدرسہ کیا ہے، مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے جہاں آدم گیری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے۔ یہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے۔ مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب ونگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے۔ جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان وادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال

کا خطرہ ہو۔اس کا تعلق براہ راست نبوت محمدیؐ سے ہے، جو عالم گیر بھی ہے اور زندہ جاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں دواں ہے، جہاں نبوت محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔"

الفاظ کی نشست و برخاست اور جملے کی ساخت پر ذرا غور کیجئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا ذخیرہ ہاتھ باندھے ہوئے صف بستہ کھڑا ہے اور حضرت مولاناؒ کو دعوت انتخاب دے رہا ہے۔مذکورہ بالا اقتباس میں خطابت کا جو آہنگ، جوش اور زور ہے صحیح معنی میں وہ براہ راست سننے سے تعلق رکھتا ہے کہ اصل تاثیر اور کیف اور مقرر کا درد وسوز تو مجلس اور وقت کا پابند ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی پڑھنے پر قاری اپنے قلب کے اندر حرارت اور تموج محسوس کرتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے تاریخ کا مطالعہ بڑی گیرائی اور وسعت کے ساتھ فرمایا تھا انہوں نے ہندوستان، یوروپ، عرب اور مسلمانوں کی پوری تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مختلف مذاہب کا مطالعہ بھی بڑی باریکی کے ساتھ فرمایا تھا، وہ اپنے آپ کو تاریخ کا ایک طالب علم قرار دینے میں فخر محسوس کرتے تھے اور بارہا خود انہوں نے اپنی زبان سے اس کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ان کی تقریروں اور خطبات کو پڑھنے اور سننے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے نشیب وفراز اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تاریخ کا مثالی اور شاندار دور اپنی تمام تر مثبت خصوصیات و امتیازات کے ساتھ پھر واپس آجائے۔

حضرت مولاناؒ نے جو خطبات طلبہ مدارس اسلامیہ کے سامنے دیئے ہیں عام طور پر اس میں ایک چیز قدرے مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے اصلاح نصاب تعلیم کا پیغام،

حضرت مولاناؒ ندوۃ العلماء کے وسیع تخیل کے امین و پاسبان تھے۔ندوۃ العلماء کے جامع تخیل میں نصاب تعلیم کو حالات حاضرہ سے ہم آہنگ کرنا سب سے بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔انہیں ایک گونہ مدراس اسلامیہ کے ذمہ داروں سے شکایت تھی کہ انہوں نے نصاب تعلیم کو ایک حد تک جامد اور خشک بنادیا ہے۔حالات کے تغیرات اور زمانہ کے انقلابات سے اسے ہم آہنگ نہیں کیا جارہا ہے۔جیسا کہ اس کی شدید ضرورت ہے۔حضرت مولاناؒ کے خطاب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ یہ نصاب عہد بعہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے۔اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے۔صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے۔حالاں کہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔"

حضرت مولاناؒ نے اپنی تقریروں میں مدارس کے طلبہ کو خاص طور پر اخلاص، جذبۂ قربانی، جوہر ذاتی کی حفاظت، جذبۂ خدا طلبی، اختصاص اور مطالعہ کے پاکیزہ ذوق کی تلقین فرمائی ہے۔یہی اوصاف ان کی اپنی ذاتی زندگی کا بھی امتیاز ہیں۔انہوں نے مدارس کے طلبہ کو بڑی قوت اور شدت کے ساتھ احساس کہتری سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔خودشناسی اور خودداری پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے اور مقرر کے جذبات کی شدت اور دردمندی و دل سوزی کا اندازہ کیجئے:

"آپ احساس کہتری کا کیوں شکار ہوں، دوسروں کا احساس کہتری ایک

نفسیاتی مرض ہے۔ مگر آپ کا احساس کہتری دینی کمزوری، ضعف عقیدہ اور ضعف ایمان کی دلیل ہے۔ جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دوررس ہیں۔ انبیاء کے نائبین اور علوم نبوت کے حاملین کو اپنی کہتری اور حقارت کا احساس ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے ناآشنا اور یقین سے خالی ہیں۔"

حضرت مولانا مدارس کے طلبہ سے "انفع" بننے کا مطالبہ فرماتے ہیں۔ انہوں نے بارہا اپنے خطبات میں فرمایا ہے کہ دنیا میں "بقائے انفع" کا قانون رائج ہے، اسی لئے اگر آپ اس عالم میں اپنی حیثیت اور ضرورت منوانا چاہتے ہیں تو آپ کو "انفع" بننا چاہئے۔ ورنہ زمانہ میں تو کسی کے لئے جگہ خالی رہتی ہے اور نہ ہی زمانہ کسی کے انتظار میں رکتا ہے۔ مولانا کی اس فکر کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن کریم کی یہ آیت ہے "فاماالزبد فیذھب جفاء واماماینفع الناس فیمکث فی الارض" جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں ہوتی، کوئی پیام نہیں ہوتا اور جو چیز کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے سکتی، اس کو قرآن کریم نے لفظ "زبد" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو "انفع" نہیں بنائیں گے تو دنیا "زبد" سمجھ کر ہمیں بیکار چھوڑ دے گی۔

حضرت مولاناؒ کے خطبات اور تقریروں میں ایک پیغام، ایک درد اور ایک سوز ملتا ہے۔ ان کی تقریریں "از دل خیزد بر دل ریزد" کا صحیح اور بہترین نمونہ ہیں۔ ایک زمانہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اس کی اہمیت اور افادیت پہلی کی طرح ہی باقی ہے۔ مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کا سوز دروں ہے۔ دل سے نکلی ہوئی بات ہے جو براہ راست دل کو دستک دیتی ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

☆☆☆

مولانا محمد ریاض الدین فاروقی ندوی

مولانا کی ایک شاہکار تقریر

۱۹۹۷ء میں مولانا علی میاں ندویؒ نے کلیۃ اللغۃ کے ہال میں آخری درجات کے طلبہ کے سامنے دارالعلوم کے ایک اہم شعبہ "المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی" میں جو تقریر فرمائی وہ ادب کا ایک شاہکار ہے یہی تقریر میرے مقالے کا موضوع ہے۔

مولاناؒ نے فرمایا:

"معہد الفکر والدعوۃ کا موضوع بڑا اہم اور دقیق ہے، اس موضوع میں تمام موضوعات سے زیادہ صواب خاطر، یکسوئی، لگن، محنت ومشقت اور توجہ واخلاص کی ضرورت ہے اور غیر معمولی زیرکی، دانائی، ذہانت اور فراست کی بھی ضرورت ہے۔"

آگے چل کر اسی پرشکوہ انداز میں مولانا فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء، اس کی مشیت اور ارادے کو معلوم کرنے اس کی ابدی تعلیمات اور حکیمانہ احکام پر عمل کرنے، اس کی ذات کا صحیح عرفان اور صفات کا صحیح علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف عقل وذہانت، فراست وتجربہ اور فکر ودانش ہی کافی نہیں۔"

اس اقتباس میں الفاظ کا انتخاب ملاحظہ کیجئے، ذات کا عرفان، صفات کا علم، عقل و ذہانت، فراست وتجربہ، فکر ودانش، الفاظ کی جوڑیاں نہ صرف کانوں میں رس گھول دیتی

ہیں بلکہ ہمارے ذہن پر غیر معمولی اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

''ادیان کی تاریخ میں عقل کا الٰہی ذات وصفات کے سلسلے میں جو حشر ہوا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ طائر عقل کی پرواز و رسائی، دین وعقیدہ کے معاملے میں بہت محدود اور تنگ ہے۔ عقل ونظر کے میدان میں یونان سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ مگر اپنی تمام تگ وتاز کے باوجود وہ حقیقی وحدانیت تک نہ پہنچ سکا۔ دنیا کے سامنے اس نے اپنے مادی اور عقلی نظریات پیش کئے، عقل اوّل، عقل ثانی اور عقل ثالث کے مرحلے سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک خالق کا سراغ لگانے چلے تو خالقین کا نصب نامہ تیار کرڈالا۔ ''الواحد لا یصدر منہ الا الواحد'' یہ ان کی آخری پرواز تھی۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے رسالہ نبوت میں نہایت منصفانہ اور حکیمانہ طریقے پر ان کے باطل نظریات کی خبر لی ہے۔ ان کے تمام فلسفیانہ اور عقلی دلائل کو نہایت محققانہ اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ رد کردیا ہے۔ یونان کی یہ شومی قسمت تھی کہ وہ الٰہیات کے مباحث میں پھنس کر خالق حقیقی کی ذات کا صحیح علم وعرفان حاصل نہ کرسکا۔ وہ اس کی اصل اور پاکیزہ صفات تک کی معرفت سے محروم و بے فیض رہا۔ یونانی فلسفہ اپنی تمام تر وسعت ودقت اور گیرائی کے باوجود ذات وصفات کے حقیقی خدوخال پیش کرنے سے قاصر وعاجز رہا۔''

وسعت و دقت، گہرائی و گیرائی، ذات و صفات، خدوخال، قاصر۔ یونانی فلسفہ الٰہیات کی تفصیل میں جاتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''اس لئے یہ بھی نظریہ پیش کیا گیا کہ دنیا کا نظام نفی پر قائم ہے، حالانکہ

اگر نفی پر قائم ہوتا تو کرۂ ارض کے تمام ترقیاتی منصوبے اور عزائم خاک میں مل جاتے۔ تمام انسانی سرگرمیاں یکسر ٹھپ ہو جاتیں، علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اثبات مفصل ہے اور نفی مجمل۔ زندگی کی گاڑی اثبات کی پٹریوں پر چلتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کو حرکت و نشاط میں لانے، تعلقات کو استوار کرنے، اشتراک عمل اور تقسیم کار کے لئے راہیں کھولنے کی تمام صورتیں اثبات کی بنیاد پر قائم ہیں۔ ہم ہمیشہ کہتے رہتے ہیں فلاح آدمی سخی ہے، فلاح بہادر و شجاع ہے، فلاں سچا اور امانت دار ہے، فلاں ذی علم اور قابل ہے، فلاں عادل اور انصاف پسند ہے اور اگر صرف یہ کہے فلاں چور نہیں ہے، فلاں جھوٹا نہیں ہے، فلاں بھوکا اور پیاسا نہیں ہے، فلاں جاہل اور بخیل نہیں ہے تو اس سے کوئی کام بننے والا نہیں۔ قرآن کی بیشتر صفات الٰہیہ اثبات پر مشتمل ہیں ''اللہ واحد، قہار، جبّار، متکبر، سبحان، باری، مصوّر، عزیز، حکیم علیم، علام، شاہد، وغیرہ ذلک'' البتہ اس کے ساتھ سلبی صفات کا بھی ذکر ہے، مگر مختصراً۔ "انـــه لیـس بظلام للعبید لا اله الا الله وحده" بہرحال عقل انسانی نے اللہ تعالیٰ کا صحیح عرفان حاصل کرنے اور اس ذات وصفات کا حقیقی علم حاصل کرنے کے سلسلے میں ٹھوکریں کھائیں۔''

یونانی فلسفہ کو باطل اور ناکارہ ثابت کرنے کے بعد مولانا کا قلم اشہب ہندوستانی فلسفے کی طرف توجہ کرتا ہے:

''یہی حال ریاضت و مجاہدہ اور کشف کا بھی ہے۔ اس میدان میں ہندوستان قدیم زمانہ سے سرخیل و سپہ سالار رہا ہے۔ بڑے بڑے

صوفی، ولی اور چوٹی کے سادھوسنت اور رشی منی پیدا ہوئے جنہوں نے نہایت ہی بھیانک بھیانک قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے کیے، ہفتوں بھوکے پیاسے رہے، فاقہ پرفاقہ کر کے، ننگے بدن رہے، جنگلوں میں درختوں کی پتیاں کھا کھا کر زندگیاں گزاریں، جانوروں کے ساتھ رہتے، لذت آمیز چیزوں سے احتراز کرتے، ان تمام کے باوجود معبودوں کا حال یہ تھا کہ ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی تھی۔"

مولانا آگے چل کر فرماتے ہیں:

"نبوت ورسالت کا تسلسل اور ہر زمانے میں اس کا نزول وورود بہت پیچیدہ مسئلہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں انسانی نفسیات وخیالات میں انقلابات آتے رہتے ہیں، ذہن وفکر میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ جذبات ومحرکات بڑھتے رہتے ہیں، وہ محرکات خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی، فکری ہوں یا عقلی، طبعی ہوں یا نفسیاتی، یہ سب بدلتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے نبوت ورسالت کے سلسلے میں خیالات وجذبات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ آج یہ تبدیلی نقطہ انتہا کو پہنچ گئی، مگر کیا کسی نے کبھی اس بارے میں غور کرنے اور فکر وتدبر کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر نبوت ورسالت کا سلسلہ کیوں منقطع ہے؟ وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کیوں بند ہوگیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر نبوت ورسالت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو انسانیت امت درامت، جماعت در جماعت، گروہ در گروہ بٹتی رہتی۔"

ختم نبوت کے معاملہ کو مولانا نے جس دلنشین انداز میں سمجھایا اور اس مسئلہ کو اس طرح حل کردیا کہ اب کسی کے دل میں کوئی وسوسہ بلکہ اس کا شائبہ بھی نہیں رہ سکتا۔

یہ سب مولاناؒ کی خطابت اور زبان کا کمال ہے۔آگے چل کر فرماتے ہیں رسالت و نبوت کا اصل مقصد انسانیت کی ہدایت و نجات ہے اور نجات اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا صحیح علم و عرفان حاصل ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ دراصل ہر زمانے میں، ہر دور میں اور ہر خطہ میں ایک تحریک، ایک مشن، ایک پیغام کی ضرورت پڑتی ہے، انسان ہمیشہ نئی تحریک، نئے انقلاب کا خواہشمند رہا ہے۔اسے نئے خون، نئے جذبات اور نئے افکار کی ضرورت ہے۔اسے ایک ایسی جامع تحریک کی ضرورت ہے جو اس کے جذبہ تجدد پسندی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔اسی ضرورت کی نفسیاتی تکمیل کی غرض سے اس امت کو مبعوث فرمایا۔رسول پاک ﷺ کا جانشین و وارث بنایا، بلاغت کلام ربانی کو ملاحظہ کیجئے کہ امت فرمایا، جماعت اور طائفہ نہیں فرمایا اور دونوں کے اندر جو نازک فرق ہے وہ ارباب فکر و نظر پر پوشیدہ نہیں۔مولانا ایک جملہ کہہ کر پھر اس کے مضمرات اور اثرات کو کھولتے ہیں یہ خطابت کا فن ہے، پہلے اجمال پھر متعاقب جملوں میں اس کی وضاحت اور تفصیل مندرجہ بالا اقتباس اس کی بہترین مثال ہے۔

حضرت مولانا کے خیال زریں ایک ایسے میڈیم انسان کی سماعت تک پہنچتی ہے کہ انسان جھومنے لگتا ہے۔الفاظ سامعہ پر صاعقہ بن کر گرتے ہیں۔اور انسان کے دل کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

☆☆☆

قاضی مزمل الدین ندوی

مسلم امت کے لئے ایک دردمند داعی کی دلسوزی
خطبات علی کی روشنی میں

آیا ہمارے دیش میں ایک خوشنوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گذر گیا

اس فقیر خوشنوا کے قدموں کی سعادت پر ہندوستان کی سرزمین ناز کرتی ہے۔ یہاں کیسے کیسے محققین، اہل علم و دانش، شیریں بیاں شعراء و صاحب طرز ادباء اور مصلحین پیدا ئے۔ ہم سب کے قدرشناس ہیں اور اس کے مقام کے اعتبار سے ان کا احترام اور ادب کرتے ہیں۔ لیکن جس بلند آہنگی، علمی متانت، استدلال کی قوت، فکری بلندی، حقیقت پسندی، لسانی شگفتگی اور دردوسوز کے ساتھ نبوی پیغام اور اسلام کے افکار و خیالات کو پوری انسانی برادری کے سامنے، اور بالخصوص عالم عربی کے علمی طبقہ اور باقتدار حلقہ کے سامنے، اور ہندوستانی مسلمانوں کی دینی و علمی قیادت کی علامت کے طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے پیش کیا ہماری حقیر رائے میں اس کی نظیر تقریباً پوری صدی میں نہیں ملتی۔ حضرت مولاناؒ کا سب سے عظیم وصف جو ان کی تمام تر خوبیوں پر حاوی ہے وہ یہ تھا کہ وہ پیغام محمدؐ کے باحوصلہ داعی تھے۔ زمانے کے حالات، اس کے تقاضوں اور چیلنجوں کا ان کو گہرا شعور تھا۔ وہ

امت مسلمہ پر منڈلانے والے فتنوں اوراس کی خطر سامانیوں سے باخبر تھے۔ وہ زمانہ کی فکر، اس کے مزاج اور نفسیات کا ادراک رکھتے تھے۔ ان میں اپنے وقت کے باطل سے آنکھیں ملا کر اسے زیر کرنے کی ہمت کی تھی۔ قومیت عربیہ، مادیت کی یلغار، سقوط ترکی اور ہندوستان کی مسلم امت کو درپیش مسائل کا جس طرح انہوں نے سامنا کیا وہ ان کو داعی مجاہد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان کی زندگی کا انتہائی قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ انہیں اپنے تمام ہمعصر بزرگوں کی عنایتیں اور شفقتیں حاصل رہیں۔ حضرت مولانا الیاسؒ سے گہرا عقیدتمندانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کی دعوتی و تبلیغی تحریک میں عملاً شریک اور اس کی ترویج واشاعت میں دل وجان سے شامل تھے۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وارشاد کا تعلق رکھتے تھے اور ان کی صحبت سے قلب وروح کی غذا حاصل کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ حاضر ہوتے تھے۔ حضرت مولانا صوفیانہ مزاج اور زاہدانہ ومشفقانہ طبیعت کے حامل تھے۔ لیکن آپ نے کبھی عزلت نشینی اختیار نہیں کی بلکہ میدان عمل میں اتر کر بتان عصر حاضر پر زوردار حملہ کیا۔ اس کے لئے ایمانی جرأت، اخلاص وللّٰہیت کا بیش بہا سرمایہ اور حوصلہ کی روحانی طاقت ان کو انہیں بزرگوں کی خوشہ چینی سے حاصل ہوئی تھی حضرت مولاناؒ فطرتاً بڑے سعادت مند تھے اپنے بڑوں اور خاندانی بزرگوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لہذا زندگی کے ہر میدان میں بلکہ اسلامی دعوت کے ہر محاذ پر اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی سوغات ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ حضرت مولانا عالمانہ ومحققانہ ذوق رکھتے تھے اور بڑی علمی بصیرت کے حامل تھے۔ جس علمی موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا یا لب کشائی کی تو یوں محسوس ہوا گویا علم کا سوتا پھوٹ پڑا ہو۔ حضرت مولاناؒ کی کوئی تقریر وتصنیف محض علمی بصیرت

پر مبنی نہیں بلکہ زندگی کے عمیق مشاہدہ پر مبنی ہوتی تھی۔

بکھر کر رہ گئی کاغذ پہ روح عصر رواں
اٹھالیا جو حیات آشنا قلم تونے

ان تمام اوصاف کے ساتھ حضرت مولانا مرحوم ومغفور اس دعوتی محاذ پر ڈٹ گئے جو اہم ترین نبوی مشن اور تاریخ کی گرانقدر شخصیات اور مختلف ادوار میں مجددانہ رول ادا کرنے والے اولیائے عظام اور بزرگان دین کا نصب العین تھا۔ پھر انہوں نے "حکمت و موعظت" کے ذریعے اور ضرورت پیش آئی تو "وجادلهم بالتي هي احسن" کے ساتھ بھی "دعوت الی اللہ" کا فریضہ جس طرح ادا کیا وہ مسلمانون کی دعوت وعزیمت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

حضرت مولانا نے ۱۹۳۹ء تک تقریباً دس سال تدریس کے فرائض انجام دئے۔ لیکن پھر ان کی مضطرب طبیعت نے انھیں بے چین کردیا کہ وہ امت مسلمہ کی ایک وسیع تر دائرہ میں خدمت انجام دیں۔ پھر ہندوستان کیا پورے عرب وعجم میں اس داعی مجاہد کی دردسوز میں ڈوبی ہوئی آواز لوگوں کو جھنجھوڑتی رہی۔ یہ بات ہندوستان جیسے ملک کے لئے بڑی عزت کی چیز اور قابل شرف وافتخار ہے کہ اس شخصیت کا تعلق ہندوستان سے تھا جس کی بات کو صرف عرب ہی میں نہیں یورپ اور امریکہ میں بھی اعتبار اور وزن حاصل تھا۔ ہندوستان کی صورتحال میں اسلام کی دعوت اور امت مسلمہ ہندیہ کے لئے درپیش مسائل میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا رول غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے آزاد ہندوستان میں پچاس سال تک "اعلاء کلمة الحق" کی جدوجہد کا محققانہ مشاہدہ اور عملی تجربہ بھی کیا اور عمر کے آخری سترہ برسوں میں تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت اور لیڈرشپ کی علامت بن چکے تھے۔ اس حیثیت سے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو

مخاطب کر کے جو نصیحتیں کیں، امراض کی نشاندہی کی اور خطرات سے آگاہ کیا وہ آج بھی نشاۃ اسلام کے لئے اور تعمیر قوم وملت کے میدان میں کام کرنے والے افراد کے لئے بیش قیمت فکری غذا اور اہم ترین سرمایہ ہے۔ حضرت مولانا کا خیال تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمان ایک باعظمت صاحب دعوت قوم اور حامل پیغام ملت کی حیثیت سے اس ملک کے نجات دہندہ ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی داعیانہ حیثیت کو فراموش کردیا بلکہ آج وہ جس طرز زندگی پر قائم ہیں وہ ان کے داعیانہ کردار کو مجروح کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"انگریزوں کی سیاست اور مسلم سیاسی قائدین کے مخصوص مزاج نے مسلمانوں کو اس ملک میں محض ایک سیاسی حریف بنا کر چھوڑ دیا ہے جس کے ساتھ نہ کوئی بے لوث دینی دعوت ہے اور نہ انسانیت کے لئے فلاح ونجات کا کوئی پیغام، پھر انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جذبات کو اتنا مشتعل کیا کہ مسلمانوں کے لئے دلوں میں ہمدردی کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی اخلاقی وروحانی دعوت جس کو اس سیاسی معرکہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں، حریف سے انتساب کی وجہ سے حریف بن گئی اور اسلامی دعوت کے لئے دروازے بند ہو گئے"

آزادی کے بعد کے سنگین حالات، مسلمانوں کی زبوں حالی اور مسلسل انحطاط کی حوصلہ شکن صورتحال اور ان حالات وواقعات کے بے رحم اشاروں کو سمجھنے کے باوجود حضرت مولاناؒ نے امت میں حوصلہ جگانے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کے ایک کھلے میدان میں ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لیکن اس کے ساتھ واقعات کا ایک درخشاں پہلو ہے اور مستقبل میں

کچھ ایسی روشنیاں نظر آتی ہیں کہ ہمارا دل نئی زندگی اور دماغ تازہ روشنی سے معمور ہو جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کے مٹنے کے بجائے اس کی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز کے آثار ہیں۔ مسلمانوں کو حالات نے اچانک ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں دین کے سوا کوئی روشنی، ایمان و توکل کے سوا جینے کا کوئی سہارا اور اسلامی دعوت کے سوا پناہ کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ وہ نادر موقع ہے کہ مسلمان اپنی زندگی پر نظر ثانی کریں اور اپنی غلط اور کمزور حیثیت کو ختم کر کے صحیح اور طاقتور حیثیت اختیار کر لیں اور یوں سمجھیں کہ آج سے ہندوستان میں ان کی اصلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت اب اس ملک میں ایک سیاسی حریف یا معاشی رقیب کی نہیں بلکہ ایک بے لوث داعی کی ہے جو اپنے فوائد و لذائذ کے لئے نہیں بلکہ نسل آدم کے مفاد کے لئے آیا ہے۔" (نشان راہ)

حضرت مولاناؒ ایک عملی انسان تھے اور انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں اور اس سے زیادہ دین و شریعت کے ان مراجع سے جن پر ان کی عمیق نظر تھی اس راز کو پایا تھا کہ حالات کی تبدیلی کے لئے خارجی دنیا میں انقلاب کے بجائے مسلمانوں کو اپنے ایمان و عقیدہ اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلم امت کو انہوں نے موثر انداز میں جھنجھوڑا کہ:

"کوہ صفا کی صاف گوئی کی تقلید اور رہنمائی میں جب ایک صبح دنیا کے سب سے سچے انسان کی آواز پر مکہ کی وادی کے بسنے والے اس انتظار و اضطراب میں جمع ہو گئے تھے کہ کسی بیرونی خطرہ اور حملہ آور دشمن کی اطلاع دی جائے

گی۔لیکن ان کو بتایا گیا کہ دشمن ان کے باہر نہیں ان کے اندر ہے۔اور سب سے بڑا خطرہ وہ ہے جو ان کی گمراہی اور غلط طرز زندگی کے نتیجے میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔اسی طرح اس کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو خود اپنے حالات کا جائزہ لینے پر آمادہ اور اس خطرہ سے ہوشیار کیا جائے جو ان پر سایہ فگن ہے اس سلسلہ میں عقائد اور اعمال اور اخلاق سے لے کر ملی فرائض،اجتماعی ذمہ داریوں اور قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی و قرآنی اصولوں اور قوانین کے جائزہ کی ضرورت ہے۔

(مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں)

اس انقلاب آفریں پیغام کے ساتھ مولانا محترم نے ان دشواریوں کا ذکر بھی کیا اور امراض کی نشاندہی کی جو آج ہندوستانی مسلم قوم کے سامنے درپیش ہیں:

''ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ قومی مزاج بن چکا ہے کہ وہ اپنی کوششوں کے جلد سے جلد نتائج دیکھ لینا چاہتے ہیں۔اور ہندوستان جیسی پیچیدہ صورتحال میں مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش ہے کہ ان کے لئے کسی ادارہ کا زیادہ دن چلانا اور کسی محاذ پر زیادہ دیر کوشش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔قوموں اور ملتوں کو عزت کا مقام حاصل کرنے،ملی مسائل کو حل کرنے اور اپنے ملی تشخصات کی حفاظت کے لئے فوری قربانیوں اور جوش و جذبات کے مظاہرہ سے زیادہ خاموش اور مسلسل جدوجہد اور صبر واستقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گذر رہے ہیں۔یہاں ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لئے ایک بڑی پرعزم لیکن دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔''

(مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں)

انہوں نے اس عزم وحوصلہ اور جہد مسلسل کے نتیجہ میں اس سرزمین پر مسلمانوں کے لئے روشن امکانات کی گواہی بھی دی۔ حیدرآباد کی دینی تعلیمی ودعوتی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ وہ ملت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہنچاسکتی ہے اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں دھنس رہا ہو اور خودکشی وخودسوزی پر آمادہ ہو بچاسکتی ہے۔ میرے محدود مطالعہ میں اس ملت کی حیات اور اس کے طویل سفر اور تجربوں میں یہ بالکل انوکھی مثال ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں ہم عظیم ترین اقلیت میں ہیں۔ یہ اتنی بڑی قلیت ہے کہ اگر وہ اپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دے، اکثریت سے زیادہ محنت سے کام کرے اور اپنی اہلیت وافادیت اپنے خلوص و صداقت کا مظاہرہ کرے تو وہ قیادت کا مقام بھی حاصل کرسکتی ہے اور اگر یہ نہیں تو کم ازکم ملک کا رخ تبدیل کرسکتی ہے اور صاحب اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت وافادیت تسلیم کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔

(مسلمانان ہند کے لئے صحیح راہ عمل)

حضرت مولاناؒ نے اپنے ایک خطاب میں جو "موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے راہ عمل" کے عنوان سے بعد میں شائع ہوا مسلمانوں کے لئے ایک لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش کی اور اسی لائن آف ایکشن پر مولانا نے اپنی زندگی میں حتی المقدور جدوجہد کی۔ ہم یہاں اس کا مختصر خلاصہ پیش کررہے ہیں۔

۱. اس وقت دنیا کے تمام مسلمانوں اور خصوصیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض اور ضروری کام رجوع الی اللہ، انابت، توبہ و

استغفار، دعا وابتہال ہے۔

۲. دوسری شرط اور ضروری وفوری قدم یہ ہے کہ معصیتوں سے توبہ کی جائے، گناہوں سے اجتناب اور احتراز برتا جائے، حقوق کی ادائیگی ہو، کیونکہ یہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے۔

۳. غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی کوشش کریں، ہمارے پاس سب سے بڑی طاقت وہ فطری، معقول پر کشش اور دل ودماغ کو تسخیر کرنے والا دین، قرآن مجید کا اعجازی صحیفہ اور نبی آخر الزماں کی دلکش ودلآویز سیرت اور آپ کی تعلیمات ہیں جو اگر کھلے ذہن سے پڑھی جائیں تو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور انھیں نے دنیا کے وسیع ترین رقبہ اور متمدن دنیا کو اپنا عاشق اور اپنے اوپر کاربند بنالیا۔ اور ملک کے ملک ان کے حلقہ بگوش اور ان کے داعی ومبلغ بن گئے۔

۴. اس سب کے ساتھ اس ملک میں صدہا سال سے مسلمان رہتے ہیں اور بظاہر ان کو اسی ملک میں رہنا ہے۔ بجائے باہم، انسانی اور شہری بنیادوں پر اتحاد وتعاون اور انسانی جان اور عزت وآبرو کے تحفظ اور انسان کے احترام اور اس سے محبت کی تبلیغ و تلقین ضروری ہے جو اس ملک کی فضا کو مستقل طور پر معتدل اور پرسکون بلکہ پرراحت اور باعزت رکھنے کی ضامن ہے۔

۵. ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں صلح پسندی، صبر وتحمل بلکہ ایثار وفیاضی کے ساتھ عزم و ہمت، صبر وثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللہ کے اجر وثواب کی طمع اور جنت اور لقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللہ کا استحضار بھی موجود و زندہ رہنا چاہئے۔ اس کے لئے انہیں ان داعیان دین اور بندگان خدا کے حالات سنانے کا سلسلہ جاری رکھا جائے جنہوں نے اللہ

کے راستہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں، قربانیاں دیں اور ان کو حصول جنت کا ذریعہ سمجھا۔

۶. بڑی ضروری اور آخری بات یہ کہ اس وقت ہر گھر کے ذمہ داروں اور والدین کو اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسل کو دین کی ضروریات سے، اسلامی عقائد، دینی فرائض اور اسلامی اخلاق سے واقف کرانے اور بنیادی تعلیم دینے کی ذمہ داری خود قبول کرنا ہے اور ان پر لازم ہے کہ اس کو اپنا ایسا ہی انسانی و اسلامی فرض سمجھیں جیسا بچوں کی خوراک اور غذا و لباس، پوشاک اور صحت و بیماری کے علاج کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے ان خطوط پر اپنی زندگی میں جدو جہد کی اور پیام انسانیت کے جلسوں میں، اصلاح معاشرہ کی کانفرنسوں میں اور ملک بھر میں منعقد ہونے والے علمی، اور دینی اجتماعات میں جو دردانگیز اور ولولہ خیز خطبات دیئے اس سے توقع کی جاسکتی تھی کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے پورے ملک سے ایک عملہ کھڑا ہو جاتا لیکن کیا کریں ہماری اس بے عملی، بے حسی اور بے ضمیری کا کہ ہم اپنی پریشانیوں، مظلومیت اور مستقبل کی مشکلات پر کسی جذباتی مقرر کی باتوں سے تو بہت مشتعل ہو جاتے ہیں لیکن کسی بنیادی کام کے کرنے یا کسی اہم محاذ پر مستقل ڈٹے رہنے اور مسلسل جدو جہد کرنے سے جان چراتے ہیں۔

موجودہ حالات میں امت مسلمہ ہندیہ کو انہیں خطوط پر پوری سنجیدگی سے کام کرنا پڑے گا اور تعمیر ملت و اعلاء کلمة الحق کی جدو جہد میں حضرت مولاناؒ کی باتیں، نصیحتیں، اندیشے اور امکانات کی نشاندہی بہت کام آئیں گی۔ ہم اپنا قلم اس آیت پر روکتے ہیں کہ امید کی کرن نظر آتی ہے۔لعل الله یحدث بعد ذلك امرا

☆☆☆

ڈاکٹر شفیع احمد ہاشم ندوی

خطبات ندوی میں اثرات اقبال

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بیسویں صدی کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے، انہوں نے دعوت وتبلیغ، علم وادب، بحث وتحقیق، تاریخ وسیر اور تحریر وتقریر کو اپنی جولان گاہ بنایا، اپنے خطبات اور تقریروں سے خوابیدہ دلوں کو جگایا اور قوت ایمانی کو بیدار کیا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد علی، شفیع داؤدی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے خطابت کو آگے بڑھایا اور سید احمد شہیدؒ کو اپنا آئیڈیل بنا کر ان کے مشن کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کیا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت اور فکری تربیت میں علامہ اقبال کے اشعار وافکار کا بڑا اثر ہے، مولانا بار بار اس کا اعتراف کرتے ہیں، اپنی خودنوشت کاروان زندگی میں اقبال سے اپنے تاثر کی وجہ بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اقبال سے تاثر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاصر اہل قلم اور اہل علم کی علمی تحقیقات وفتوحات اور پیش رفت اور مواد ومعلومات کے ماخذ ہم کو معلوم تھے، اور کم وبیش ہماری اس پر نظر تھی اور اس میں کسی نوع کی شرکت ہم کو بھی حاصل تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ محنت ومطالعہ، پیش کرنے کا سلیقہ اور کہنہ مشقی سے ہم بھی اس منزل کو پہونچ سکتے، یا اس کی سرحد کو چھو سکتے ہیں، لیکن اقبال کے افکار وخیالات، ان کے سوز وساز کا سرچشمہ ہماری دسترس سے باہر تھا اور

ہم ان کو پڑھ کر یا سن کر محسوس کرتے تھے کہ یہ کسی اور عالم کے خیالات ہیں اور اس کا تعلق ذہانت، علم اور وسعت مطالعہ سے نہیں "فیضان" سے ہے۔"

(کاروان زندگی حصہ اول: ص ۱۷۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اقبال کے گرویدہ تھے ان کے اشعار کو بہت پسند کرتے تھے، اپنے افکار وخیالات کی ترجمانی کے لئے علامہ کے اشعار کو تمثیل سمجھتے تھے، وہ اقبال کو اپنے پسند کا شاعر اور اپنے معیار کا الہامی مفکر سمجھتے تھے اور اپنے فکر وعقیدہ، شعور واحساس کا ہمنوا گردانتے تھے، مولانا خود فرماتے ہیں:

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے اشعار اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر النفس وآفاق کے لئے ابھارتا ہے جو مہر ووفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے۔"

(نقوش اقبال: ص ۳۴)

مولانا کے فکر وخیال پر اقبال چھائے رہتے تھے اور اپنی تحریر وتقریر میں وہ کلام اقبال کو استعمال کرتے تھے۔ جب مولانا قاہرہ تشریف لے گئے اور وہاں جو آپ نے پہلی تقریر کی، اس کا عنوان اقبال کا یہ مصرع تھا۔ "محمد عربی سے ہے عالم عربی" (محمد روح العالم العربی) اس موضوع کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا، بقول ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ "اللہ نے لکھنے اور بولنے کی جتنی بھی صلاحیت آپ کو دی تھی وہ صرف کردی، اتنی

طاقت کے ساتھ جو وحی والہام کے بعد حوصلہ بشری اور قوت بشری سے توقع کی جاسکتی ہے" اور یہی وہ مصرع ہے جو زندگی کے آخری ایام میں عالم اسلام کی بڑی شخصیت کا ایوارڈ لینے کے لئے دبئی تشریف لے گئے اس میں بار بار اس شعر کو پڑھا:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

اسی طرح اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا بیشتر حصہ نقل کیا ہے "ملی وحدت اور اس کے تقاضے" کے عنوان سے کراچی میں ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید صاحب کے منعقد کردہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آپ ساتویں صدی مسیحی کے نقشے میں دیکھیں، جغرافیائی نہیں، بلکہ ان کی باہمی آویزشوں اور ان کی جنگوں کے نقشے میں دیکھیں، ان کے احساس برتری کا اور ان کے نشۂ قوت کا دنیا پر جو اثر پڑا تھا، اس کو اقبال نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا:

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمین گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

(دعوت فکر و عمل: ص،۲۶)

عالم اسلام کی وحدت اور شیرازہ بندی پر ایک بڑے اجلاس کو خطاب کرتے

ہوئے فرماتے ہیں۔

''ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ تنہا اپنے ملک میں وحدت کے علمبردار ہیں بلکہ اس وقت دنیا کے سیاسی نقشہ میں اس اسلامی وحدت کے دعویدار ہیں اور اس وحدت کو Demonstracte کرنے والے ہیں۔اگر اس وحدت سے دستبردار ہوجائیں گے آپ کے ملک میں لسانی جھگڑے یا تہذیبی جھگڑے یا پرانی یا علاقائی تہذیبوں کے احیاء کا فتنہ سر اٹھائے گا اس لیے کہ اس ملک کے مختلف عناصر ترکیبی کو جو چیز مربوط کرتی ہے وہ وحدت ایمانی ہے،وحدت عقیدہ ہے،وحدت اسلامی ہے جس کو اقبال کہتا ہے:

بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(دعوت فکر وعمل،ص،۵۱)

کراچی یونیورسٹی میں ''عالم اسلام میں اعلی تعلیم کا مقصد ومنہاج'' کے عنوان سے علماء،طلبہ اور دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے وہ کیرکٹر بنائے،وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں،جن کو دنیا کی کوئی طاقت،کوئی تخریبی فلسفہ،کوئی غلط دعوت،کوئی حکومت ان کو کسی دام خرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں کہ:

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(دعوت فکر و عمل، ص:۱۲۱)

اقبال کے اسی پیغام کو حضرت مولانا مزید قوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

"آج ملت اسلامیہ کو ایک ضرب کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ قوموں کی کشتی اس کے بغیر ساحل تک نہیں پہنچ سکتی۔ جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک معجزے کے طالب ہیں۔ یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(دعوت فکر و عمل، ص:۱۲۴)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں "اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اس کے اسباب" کے موضوع پر علماء اور دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"جس مفکر اسلام سے اس جامعہ کو نسبت ہے وہ موجودہ نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھا۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید مطالبہ اس کا کرتے کہ سب سے پہلے نظام تعلیم بدلا جائے، اس لیے کہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ تیزاب ہے جس میں انسان کی خودی کو ڈال کر بالکل تحلیل کر دیا جاتا ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(دعوت فکر و عمل، ص:۱۳۵)

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں جامعہ کے اعلیٰ عہدے داروں، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ معززین شہر، علماء اور دانشوروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے سیاسی قائدین اور قومی رہنماؤں نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، جو قومیں ہمارے حصہ میں آئی ہیں، وہ قومیں کیسی ایمانی طاقت، کیسی قربانی کی طاقت، کیسا جذبہ، کیسی گرم جوشی، کیسی سادگی، کیسی محبت اپنے اندر رکھتی ہیں، کیا اس کے لئے ضرورت نہیں ہے کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جو دلوں کی اس سرزمین میں ان مسلم اقوام کی ان صلاحیتوں کے متعلق تحقیقات کرے اور ان کے ابھارنے کے ذرائع معلوم کرے اور پھر ان کو کلٹی ویٹ (CALTIVATE) کرے، ان کی پرورش کرے، ان کی نشو و نما کرے، اگر یہ کام ہو گیا تو دنیا میں عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا، میں اقبال ہی کے الفاظ میں شکوہ سنج نہ صرف ایران سے بلکہ اس تحتی براعظم بلکہ عالم اسلام سے ہوں کہ:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اور پھر اپنے دل کو تسلی دوں گا اور آپ کو مژدہ سناؤں گا کہ:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

(دعوت فکر و عمل، ص:۱۴۵)

پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اسلامی جمعیۃ الطلبہ کے جلسے کا آغاز کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"مجھے آپ کی اس مجلس میں آ کر وہ مسرت ہوئی جس کو کسی ایسے

دعوت کے خادم سے یا مدرسہ کے ایسے استاد سے پوچھنا چاہئے جس کو نوجوانوں پر اور ملت نو بہاروں پر اپنا خون جگر صرف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو اور جو ایسے نوجوانوں کو دیکھنے کی تمنا کرتا ہو جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

(دعوت فکر وعمل، ص:۱۵۷)

اسی ذیل میں حضرت مولانا اقبال کے پیغام کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

"اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ مادیت کا مقابلہ کریں جس کو یورپ و امریکہ نے اپنے بہترین اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے، اس کی ہر چیز اتنی بھانے والی ہے کہ بڑے بڑے شیروں کے پاؤں اکھڑ جائیں، تو اس کا مقابلہ ہم محض تنظیم سے، محض ضابطۂ اخلاق سے نہیں کر سکتے، اس کے لئے ہمارے اندر ایمانی طاقت ہونی چاہئے، تعلق مع اللہ ہونا چاہئے، اللہ کے ساتھ ایسا تعلق ہونا چاہئے، ہم کو ایک سجدہ نصیب ہو جائے جس کی زمین بھی تاب نہیں لاسکتی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

روح زمیں کانپے نہ کانپے، اپنا کلیجہ تو کانپ جائے، اپنا دل تو کانپ جائے، آنکھیں تو اشکبار ہو جائیں، یہ سجدہ جب آپ کو نصیب ہوگا تو آپ کو مادیت پر قابو ہوگا۔

(دعوت فکر وعمل، ص:۱۵۷)

مغربی تہذیب اور جدید استعمار کی یلغار سے خبردار کرتے ہوئے اور اسلامی، اخلاقی اور انسانی اقدار کی طرف دعوت فکر دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب تمدن اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جب وہ اخلاقیات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے، جب انسان اپنی سفلی خواہشات اور نفس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے سوا ہر مقصد اور ہر حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے، جب اس کے پہلو میں انسان کے دل کے بجائے بھیڑئے اور چیتے کا دل پیدا ہو جاتا ہے، اس کے جسم میں ایک فرضی معدہ اور ایک لامحدود نفس امارہ جنم لیتا ہے، جب دنیا پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو قدرت خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے جنون کے نشہ کو اتارنے کے لئے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جراح پیدا کرتی ہے:

کرتی ہے ملوکیت انداز جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا علی میاںؒ ندوی نے اپنی تحریروں اور تقریروں کو کلام اقبال سے مزین کیا ہے، نمونہ کے طور پر چند خطبات سے میں نے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں مضامین اور تقاریر ہیں جن میں مولانا نے اقبال کے اشعار کو بڑے خوبصورت اور حسین پیرایے میں پیش کیا ہے، حضرت مولانا کی اقبال نوازی اور اقبال فہمی پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے مایہ ناز ادیب اور ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

"مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایک متبحر عالم اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا،

موصوف نے اقبال کی تائید اور ترجمانی جس خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے۔"

(مقدمہ نقوش اقبال، ص:۲۵)

سفیر مصر برائے پاکستان اور سابق پروفیسر فارسی قاہرہ یونیورسٹی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے علامہ اقبال کے اشعار کو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں، لیکن نظم میں ہونے کی وجہ سے اور فارسی پس منظر اور تصوف کی اصطلاحوں کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگ ان کے ترجموں سے علامہ اقبال کو نہیں سمجھ سکے، لیکن مولانا اپنی قاہرہ کی تقریروں میں جس کا مجموعہ "روائع اقبال" ہے اقبال کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں ان کے اشعار کی روح آگئی ہے۔ اس کا اعتراف علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جیسے اغلباً اقبال محسوس کرتے تھے۔"

(نقوش اقبال، ص:۱۸)

حضرت مولانا مرحوم کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی خدمات کا ثبوت ہزاروں صفحات پر مشتمل عربی و اردو کی وہ تقریریں ہیں جن میں وہ انسانی زندگی کے ہر موضوع اور پہلو کا احاطہ کرتے ہیں، ان کے وہ سینکڑوں مقالات وخطوط ہیں جن میں وہ انسانی زندگی کے عروج وکمال، سعادت وفلاح کا راز بتاتے ہیں، مولانا نے ان خطبات وتحریر میں علامہ اقبال کے اشعار کو نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے۔

مولانا علی میاںؒ کے خطبات کا ادبی حسن اور خاص کمال یہ ہے کہ وہ دلوں کو چھوتا اور

دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور جب کسی کی بات دل میں اترتی ہے تو دماغ بھی اس کو قبول کرلیتا ہے۔ اسلاف کے قیمتی سرمایے سے خوشہ چینی، موزوں استدلال، آیات و احادیث سے استنباط، اشعار کا برمحل پیش کرنا، تاریخ اسلامی کے موثر واقعات کا استعمال، مثبت طرز تخاطب، علمی اور تعمیری تنقید مگر بہت احتیاط ولحاظ کے ساتھ، اصولی باتوں پر توجہ، خیرخواہانہ نصیحت، جارحانہ طرز کلام سے اجتناب اور انسانیت کی تعمیر پر زور ہے۔

☆☆☆

لوہے کو چٹکی میں پگھلتے دیکھا
سکہ اسی داؤد کا چلتے دیکھا
وہ چاہے تو اسباب ضروری بھی نہیں
مٹی کا دیا ہوا میں جلتے دیکھا

☆

بے ساختہ ملتا ہے حقیقت کا سراغ
روشن ہوجاتے ہیں بے نور دماغ
سورج کے اجالے بھی کرتے ہیں سلام
جلتے ہیں محبت میں جو مٹی کے چراغ

رئیس الشاکری ندوی

اقبال انصاری
الیف ۶ ۱۷ ۔پانڈونگر، دہلی ۱۱۰۰۹۱

"فنطاسیہ کا سیاح"

اس بار بھی رس جب اپنی لمبی سیاحت سے واپس آئی تو ہم سب دوستوں نے پھر ایک شام اسے گھیر لیا۔ خدا نے اسے خوب دولت دی ہے، خوب تندرستی دی ہے، خوب آزادی دی ہے، اس لئے من چاہی زندگی گزارتی ہے۔ سیاحت کی دیوانی ہے۔ سال میں مشکل سے دو تین مہینے ملک میں رہتی ہے، باقی وقت گھومتی رہتی ہے، سیر کرتی رہتی ہے۔ ہمیشہ جب لوٹ کر آتی ہے تو ہم لوگ اسے گھیر لیتے ہیں، اس لئے نہیں کہ ہم سب کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے لے کر آتی ہے، بلکہ اس کا حال چال پوچھنے اور حال چال پوچھنے سے زیادہ اس کی سیاحت کے قصے اور اس کے تجربات سننے کے لیے۔

بہترین داستاں گو ہے۔ بڑی ہی دلچسپ انداز میں نئی نئی جگہوں، نئے نئے ملکوں کے قصے سناتی ہے۔ اس کی ہر کہانی ہر قصہ ہمیں شاک دیتا تھا۔ اس شام ہمیں تحفے دے کر بولی۔ "اس بار فنطاسیہ جانے کا موقع مل گیا۔ فنطاسیہ سے متعلق ایک قصہ بھی معلوم ہوا۔ بہت دلچسپ ہے۔ سناؤں گی مگر پہلے فنطاسیہ کے بارے میں سنو۔؟ خوبصورت ملک ہے.... چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ قدرت نے حسن سے اسے نوازنے میں بڑی دریا دلی سے کام لیا ہے، کروڑوں کی تعداد میں ناریل اور کیلے کے درخت،

لونگ، الائچی، کاجو اور جائفل کے باغات، پورے ملک میں نرم ہواؤں کی سیرِ مدام، موسم نہ سرد نہ گرم، نیلگوں پہاڑوں پر رعنائیاں اتراتی پھرتی ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کبھی نہ تھمے، نیلے آسمان پر نظر جاتی ہے تو لوٹنے کا نام نہیں لیتی ہے۔ سمندر کا پانی ایسا سبز کہ تصور میں نہیں سماتا... جیسے خواب میں سبز ریشمی خواب لہرا رہا ہو۔ ساحل ایسے حسین کہ مرینا، کیلن گوٹ اور کووِلم کیا، برائٹن اور میامی بھی دیکھ لیں تو پانی پانی ہوجائیں۔ کلووڈیل (لونگ کی وادی) سے گزرو تو وجود پر مسالے دار نشہ چھاجائے.....کارڈی مم ویلی (الائچی کی وادی) میں جاؤ تو جی چاہے کہ یہیں موت آجائے، سڑکیں جیسے دھلے ہوئے سیاہ آئینے، عمارتیں جیسے سپنوں کی مدھم مدھم اٹھانیں، کثافت اور آلودگی جزیرے سے کوسوں دور۔ ہر شخص کے پاس اپنا گھر، گھر میں ضروریات کا اعلا درجے کا تمام سامان، ہر گھر میں ایک بچہ اور ناریل، کاجو اور کیلے کے دو درخت، ہر گھر کے ساتھ ایک خوشنما پائیں باغ، جس میں ایک طرف مرغیوں کے ڈربے اور ایک طرف پھولوں کے پودے، دوسری طرف ترکاریوں کی خوبصورت کیاریاں۔ ہر گھر میں بائسکل، گھر چاہے ضلع کے حاکم کا ہو یا مچھیرے کا....ٹوائلٹ کی صفائی سے جوتے پالش تک ہر کام ہر شخص خود کرتا ہے۔ منسٹر تک خود اپنے کپڑے دھوتا ہے، پرائم منسٹر تک کو اپنی بیٹی کی شادی سڑک پر جھاڑو دینے والے صفائی کرمچاری کے بیٹے سے کرنے میں کوئی عار یا تردد نہیں۔ آبادی ہوگی یہی کوئی ساٹھ لاکھ۔ انگور بے پناہ پیدا ہوتا ہے، لیکن کھایا جاتا ہے، شراب نہیں بنائی جاتی۔ ناریل، کاجو، کیلے اور انگور کے اس ملک کی عورتیں تک چھ فٹ سے کم نہیں ہوتیں، لوگ کسی بھی قسم کا نشہ نہیں کرتے، اس لئے قلب، جگر، معدے اور آنتوں کے امرض یا کینسر جیسی نامعقولیت پورے ملک میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ ہر شخص ناشتے میں دودھ، مکھن، انڈوں اور بریڈ کے ساتھ ایک

سیب اور ایک سرخ کیلا جس کا وزن دو سو گرام ہوتا ہے ضرور رکھتا ہے۔ دوپہر کا کھانا سرخ موٹے چاول اور مچھلی، اور رات کا کھانا سبزیوں اور روٹیوں پر مشتمل ہے۔ دونوں وقت لہسن ناریل کی چٹنی کثرت سے کھائی جاتی ہے۔ شام چار بجے ایک ناریل کا پانی یا مالٹو کا رس ہر شخص ضرور پیتا ہے، اس لئے ملک میں کسی بھی قسم کی بیماریاں نہیں پائی جاتی ہیں۔ ہسپتال ہیں لیکن وہاں زچہ بچے کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہے ہی نہیں کوئی کام ہونے کے لیے۔''

ہم لوگ بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ایک لمحہ ٹھہر کر پھر کہنا شروع کیا۔ ''جرم نہیں ہوتے، لیکن پولیس ہے۔ پولیس کا کام صرف یہ ہے کہ اسکول جاتے ہوئے اسکول سے آتے ہوئے بچوں کو حفاظت کے ساتھ سڑک پار کرنے میں مدد کرے.... یا اگر کسی خاتون کی پھلوں کی ٹوکری سڑک پر گر گئی ہو، اور پھل زمین پر بکھر گئے ہوں تو پھر سمیٹ کر ٹوکری میں رکھنے میں اس خاتون کی مدد کرے، یا چوراہوں پر کھڑے ہوئے ٹریفک کنٹرول کرے، یا سڑک پر یا کسی کھیل کے میدان میں یا ریلوے اسٹیشن کے کسی حصے میں ایسے وقت کوئی پتہ آ گرا ہو جب صفائی کرمچاری کسی وجہ سے آس پاس نہ ہو تو اس پتے کو اٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں ڈال دے۔ چوری، ڈکیتی، رہزنی، لوٹ مار، دھوکا دھڑی، جیب تراشی، فوجداری، قتل، چور بازاری، جمع خوری، خواتین سے چھیڑ چھاڑ، زنا جیسے افعال کے تصور کو ہی اس ملک کے باشندوں نے ختم کر دیا ہے۔ ہر شخص کو ذہنی آسودگی حاصل ہے، اس لئے جرم ہونے کا سوال ہی نہیں۔ نا آسودہ ذہن میں ہی جرم کے جراثیم جنم لیتے ہیں اور پنپتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، سبھی کو چہرہ اور انگلیوں سے لے کر کلائی تک جسم کھلا رکھنے کی اجازت ہے..... باقی پورا جسم ڈھیلے کپڑوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ گیمز کے رسیا رہے ہیں۔ ورزش سبھی کرتے ہیں، عورتیں بھی، مرد بھی۔ ان

کا اپنا لٹریچر ہے۔ سوفو کیلز، ہومر، دانتے، گیٹے، شیکسپئر، ایس ایلیٹ، موپاساں، تالسطائی، گورکی، چیخوف، کالی داس اور ٹیگور تک کو انہوں نے برسوں پہلے ملک بدر کردیا تھا۔ آج کا چالیس برس کا آدمی بھی ان ناموں سے واقف نہیں ہے۔ جو سیاح آتے ہیں ان کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے کہ کہیں وہ اپنے ملک کا کوئی لٹریچر یا اخبار، منشیات یا سگریٹ۔ بیڑی لے کر نہ آئے ہوں، اگر ایسا کچھ پایا جاتا ہے تو ضبط کر کے اسے سیاح کے سامنے ہی ضائع کردیا جاتا ہے، اور کوئی سیاح اس ضیاع پر راضی نہیں ہوتا تو اسے ہوائی اڈے یا بندرگاہ سے ہی واپس کردیا جاہے۔"

رس ایک لمحہ کو پھر خاموش ہوئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور کہنا شروع کیا "ایک دوپہر راجدھانی کے پولیس پوسٹ میں ایک سیاح داخل ہوا۔ ڈیوٹی آفیسر نے کھڑے ہوکر اس کا استقبال کیا اور نہایت ادب سے کرسی پیش کی۔

"شکریہ.........میں........" سیاح نے اپنا نام بتایا اور پاسپورٹ بڑھایا....اور بتایا کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے؟

مالٹوں کا؟" آفیسر نے پوچھا۔

"کرایہ.....کچھ بھی نہیں"

"ناریل پانی ہی لے لیجئے" آفیسر نے التجا کی۔

"جی شکریہ.....آپ میری رپورٹ لکھ لیجئے۔" سیاح نے کہا۔ چہرے سے بہت پریشان لگ رہا تھا۔

"رپورٹ!!" آفیسر بھونچکا رہ گیا "کس بات کی رپورٹ؟"

"میرے پانچ ہزار کے نوٹ کسی نے چرا لئے۔" سیاح نے بتایا۔

"چرا لئے!" آفیسر اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے آسمان کا کوئی حصہ ٹوٹ

کر گرنے کی اطلاع دی ہو۔

''جی ہاں.... میں سنہری پارک میں بہار کا جشن دیکھ رہا تھا، بہت بھیڑ تھی.... وہیں کسی نے میرے بیگ سے پانچ ہزار کے نوٹ نکال لئے۔ ہزار ہزار کے پانچ نوٹ تھے'' سیاح نے بتایا۔

''آپ کو یقین ہے کہ آپ اپنی رقم اپنے ہوٹل کے کمرے میں نہیں بھول آئے ہیں؟'' آفیسر نے پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' سیاح نے کہا ''ساری رقم میرے پاس تھی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو آپ کی کرنسی کے چھ ہزار میرے پاس تھے۔ آج صبح تک میں ایک ہزار خرچ کر چکا تھا۔ باقی پانچ ہزار میرے بیگ میں تھے۔ بیگ میرے شانے پر لٹکا ہوا تھا۔ میں جب سنہری پارک سے نکلا تو میں نے چیک کیا۔ نوٹ بیگ میں نہیں تھے۔ بیگ کا زپ کھلا ہوا تھا۔''

''مجھے حیرت ہے...... مجھے واقعی حیرت ہے۔ ہمارے یہاں چوری نہیں ہوتی۔'' آفیسر بڑبڑایا۔

''لیکن میرے نوٹ چوری ہوئے ہیں'' سیاح نے بلبلا کر کہا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ ''میں تباہ ہو گیا۔ اب میرے پاس ایک نوٹ بھی نہیں ہے۔ واپسی کا ٹکٹ تو میرے پاس ہے مگر......''

''آپ گھبرائیے نہیں... بالکل فکر مت کیجئے۔ آپ کی رقم مل جائے گی۔'' آفیسر نے ہمدردی کے ساتھ تسلی دی اور پوچھا ''کل رقم اسی بیگ میں تھی؟''

''جی ہاں'' سیاح نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''آپ میرے ہوٹل کے کمرے کی تلاشی لے لیجئے اب میرے پاس ایک نوٹ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں جناب، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔''
آفیسر نے پھر تسلی دی۔ ''ممکن ہے آپ کے نوٹ بھیڑ میں کہیں گر گئے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو شام تک کوئی نہ کوئی آپ کی رقم یہاں پولیس پوسٹ میں جمع کرا جائے گا.... آپ اطمینان سے اپنے ہوٹل جایئے، بلکہ میں آپ کو پولیس کی گاڑی سے ہی بھجوائے دیتا ہوں۔ آپ شام کے پانچ بجے تک انتظار کیجئے اگر آپ کی رقم نہ ملی تو حکومت آپ کا پورا نقصان بھر دے گی۔ ہاں اپنا بیان ضرور لکھ دیجئے۔''

سیاح نے اپنا بیان لکھ دیا۔ آفیسر نے بڑی عزت کے ساتھ پولیس کی گاڑی میں اسے ہوٹل بھجوا دیا۔ شام کو ٹھیک پانچ بجے آفیسر نے اس کے کمرے پر دستک دی۔ سیاح نے دروازہ کھولا۔

''میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں.... آپ کی رقم تو نہیں ملی، لیکن حکومت نے آپ کا نقصان بھر دیا ہے.... یہ لیجئے پورے پانچ ہزار ہیں'' کہہ کر آفیسر نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ سیاح کو پکڑا دیئے۔ سیاح کا چہرہ کھل اٹھا۔

''شکریہ آفیسر میں نے آپ کے ملک کی بہت تعریف سنی تھی.... ویسا ہی پایا آپ لوگ واقعی بہت اچھے ہیں۔'' سیاح نے مسرت اور عقیدت کے ملے جلے جذبے کے اظہار کے ساتھ آفیسر سے ہاتھ ملایا۔

''میں خود اپنی طرف سے، اپنی حکومت اور اپنے پورے ملک کی طرف سے آپ سے شرمندگی کا اظہار کر رہا ہوں اور معافی مانگ رہا ہوں کہ یہاں آپ کو ذہنی پریشانی سے گزرنا پڑا۔'' آفیسر کے چہرے پر واقعی خجالت تھے۔ ''یقین کیجئے ہم چور کو ضرور پکڑ لیں گے۔ اب اجازت دیجئے۔''

آفیسر کے رخصت ہونے کے بعد سیاح نے ایک پوسٹ کارڈ پر اسی وقت اپنے ملک کے ایک عزیز دوست کو مختصراً سارا حال لکھا کہ کس طرح اس کی رقم چوری ہوئی اور کس

طرح حکومت نے اس کا نقصان بھرا۔ آخر میں فنطاسیہ اور اہل فنطاسیہ کی تعریف کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ابھی وہ تقریباً دس دن اور یہاں رہے گا۔ خط لکھ کر اس نے ہوٹل کے پوسٹ بکس میں ڈال دیا۔ ڈاک دن میں دوبار نکلتی تھی۔ کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

تین دن کے بعد سیاح ٹرین سے ہالکم کے لیے روانہ ہوگیا۔ ہالکم کا باسٹھ کلومیٹر کا پہاڑی راستہ، جس پر پیلے رنگ کے دوڈبوں کی ننھی سی نیروگیج ٹرین چلتی ہے، انتہائی خوبصورت ہے۔ دونوں طرف گہری لیکن سبز گھاٹیاں ہیں۔ ننھے ننھے چشمے پتھروں کی دراڑوں سے پھوٹ کر اٹھلاتے ہوئے نشیب میں گرتے ہیں۔ پرندوں کی موسیقی اور چشموں کے سنگیت کا امتزاج ہمہ وقت سماعت سے گزر کر روح کو گدگداتا رہتا ہے۔ قدم قدم پر جنگلی پھولوں کی زرد، نیلی اودی اور گلابی فراوانی، کہیں زمین اگر مسطح تو سیب کے تندرست درخت۔ اور سیب ایسے بھرپور گویا رس خود بہ خود باہر آنے کو بے تاب..... حسن، حسن.... لگتا ہے جیسے قدرت اس ملک کے روپ میں سمندر سے بے اختیار ابل پڑی ہو۔ سیاح کو لگا گویا حسن اس کا ہم سفر ہو۔ خوبصورتی سی خوبصورتی تھی!

بالآخر ہالکم اسٹیشن آگیا۔ سیاح ٹرین سے اترا۔ اور گرفتار کرلیا گیا۔

پولیس پارٹی کی قیادت وہی مہربان پولیس آفیسر کررہا تھا جس نے راجدھانی میں سیاح کی مدد کی تھی۔ اس نے کہا ”ہمارے ملک میں چوری، لوٹ مار اور دھوکہ دھڑی کی سزا عمر قید ہے.... قید با مشقت ...... اور یقین کرو کہ ہماری جیل میں جتنے بھی قیدی عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں.... سبھی غیر ملکی ہیں..... سیاح.. نہیں، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں..... سیاحوں پر ہم کڑی نظر رکھتے ہیں..... تم نے بڑے سلیقے سے ہمیں لوٹنے کا پروگرام بنایا.... کافی چالاکی سے کام لیا...... اپنے کسی دوست کو خط لکھا تاکہ اگر ہمیں کچھ شک بھی ہو تو ختم ہو جائے، مگر تمہاری بدقسمتی کہ ہم احمق نہیں ہیں کہ ہم نے جو نوٹ

تمہیں دئے تھے ان کے نمبر ہم نے نوٹ کر لئے تھے۔ ہوٹل کا بل چکانے، ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے، اور ریل کا ٹکٹ خریدنے کے لئے تم نے جو نوٹ خرچ کئے ہیں ان میں سے کوئی نوٹ ہمارا دیا ہوا نہیں ہے، جب کہ تم کہہ چکے تھے کہ تمہاری کل رقم چوری ہوگئی۔ پھر یہ چھوٹے نوٹ جو تم نے خرچ کئے، کہاں سے آئے، مجھے تم پر شروع سے ہی شک تھا، اس لئے ہم نے تمہاری نگرانی کرائی۔"

سیاح سمجھ گیا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔ پولیس پارٹی اسے لے کر روانہ ہوگئی۔ راستے میں اس نے آفیسر سے پوچھا "آپ کو مجھ پر شک کیسے ہوا؟"

آفیسر نے کہا "تم ہی بتاؤ"

سیاح نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "کیا اس لئے کہ تمہارے ملک میں چوری، لوٹ، دھوکہ دھڑی، یہ سب نہیں ہوتا؟"

آفیسر نے کہا "نہیں، بلکہ اس لئے کہ تمہارے ملک میں یہی سب ہوتا ہے۔"

ہم سب ایک سناٹے کے عالم میں بیٹھے اس سیاح کا قصہ سن رہے تھے۔ رتن کے خاموش ہوتے ہی ہم سب گویا ایک عالم خواب سے عالم حقیقت میں واپس آگئے، پھر راکیش چونک کر بولا "یار یہ بتاؤ کہ یہ ملک فیطاسیہ جس کی کہانی تم نے سنائی ہے، یہ ہے کہاں؟"

رتن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی "اس کہانی میں دو باتیں اہم ہیں۔ پہلی یہ کہ اس ملک کا وجود دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور دوسری یہ کہ اس سیاح کا وجود آج دنیا کے ہر ملک میں ہے"

☆☆☆